کلام رب العالمین

بجواب قرآن کے مصنفین

پیشکش

الحاد ڈاٹ کام

فہرست مضامین

ابتدائیہ

چند دن پہلے ایک ملحد سید امجد حسین نے قرآن کے موضوع پر ایک تحریری سلسلہ شروع کیا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قرآن کوئی الہامی کلام نہیں ہے۔ یہ صاحب مقدس شخصیات کی شان میں گستاخیوں کے حوالے سے مشہور ہیں، کچھ عرصہ پہلے انہوں نے حضرت حمزہ اور حضرت محمد ﷺ کی عمر کے فرق پر ایک تحریر لکھی جس میں کچھ روایات کی بنیاد پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ محمد ﷺ عبداللہ کے بیٹے نہیں تھے کیونکہ عبداللہ شادی کے فوراً بعد وفات پا گئے تھے۔ انکی اس تحریر کے کمنٹس میں انکے گروپ میں حضور ﷺ کی شان میں بدترین گستاخی کی گئی اور آپ ﷺ کو ننگی گالیاں دی گئیں۔ اسی تحریر پر انہی کے گروپ میں ہمارے ایک دوست نے انکے ساتھ مناظرہ میں انکے جھوٹ و مکر کو پوری طرح عیاں کیا، اس پوسٹ پر یہ صاحب بری طرح لاجواب ہوئے اور اس گستاخی پر معافی مانگنے کے بجائے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بحث ختم کر دی۔ وہ مناظرہ اور ہماری سائیٹ پر اس لنک سے دیکھا جاسکتا ہے۔ حال ہی میں صاحب نے حضور ﷺ کی معاش کے حوالے سے ایک لمبی چوڑی کہانی گھڑی۔ اسکا جواب ہماری سائیٹ پر پہلے سے موجود تھا، انکا وہ فلمی اسکرپٹ بھی بری طرح فیل ہوگیا۔ اب صاحب نے قرآن کے موضوع پر مستشرقین کے مفروضوں کو مزید جھوٹ سے لیس کر کے پیش کیا ہے۔ طریقہ واردات وہی پرانا ہے کہ پرانی کتابوں کے ملتے جلتے احکام، مشہور لوگوں اور شعراء کے ذومعنی اقوال، اشعار وغیرہ کی ایک فہرست مرتب کی جائے اور پھر انکو اپنی مرضی کا سیاق و سباق دیتے ہوئے ایک کہانی اور واقعے کی شکل دے دی جائے اور پھر اسکی بنیاد پر یہ دعوی کر دیا جائے کہ فلاں مشہور کتاب تو قدیم کتابوں، لوگوں کی تحقیقات اور کلاموں سے ماخوذ ہے۔ ان صاحب نے بھی ایسا ہی کیا اور انتہائی سطحی مشابہت کو بھی اصل قرار دینے کی کوشش کی، جہاں تک اس سے ہوسکا اس نے واقعات کو توڑ موڑ کر ایک نیا رنگ دے کر پیش کیا، جہاں اسکی کہانی کا ربط خراب ہونے لگا اس نے اپنی طرف سے باتیں گھڑ کے اسکو درست کر دیا۔ مقدمے کی بنیاد جھوٹ تھی اس لیے ساری تحریر تضادات کا مجموعہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مستشرقین کے قرآن اور صاحب قرآن کے متعلق ایسے تمام مفروضوں کا ہر لحاظ سے تحقیقی جواب آج سے سو سال پہلے محققین اسلام نے دیا دے تھا۔ اس کے بعد ان مستشرقین کو تو یہ اعتراضات دوہرانے کی ہمت نہیں ہوئی ' البتہ گزشتہ دس سالوں سے کچھ مجہول لوگ فیس بک کے ذریعے سامنے آئے ہیں ، جنکی علمی و اخلاقی حالت یہ ہے کہ یہ جھوٹ بولنے کو جرات اور مفروضے گھڑنے کو تحقیق کہتے ہیں۔ انکی اس کم علمی، کم ظرفی اور سستی نے انہیں مجبور کیا ہے کہ یہ مستشرقین کے ان اگلے نوالوں کو دوبارہ چبا کے پیش کریں ، مسلم نوجوان طبقہ اپنے علمی ورثے سے لاعلم ہے شاید ان پر یہ وساوس اثر کرجائیں اور وہ تشکیک کا شکار ہوجائیں اور اس بہانے انکا علمی بھرم بھی رہ جائے۔

قرآن کے موضوع پر مذہب فلسفہ اور سائنس پیج سے اب تک تاریخ و تدوین قرآن، قرات قرآنیہ ، نسخ فی القرآن، اعجاز القرآن کے موضوع پر تحاریر پیش کی جاچکی ہیں۔ اعجاز القرآن کے موجودہ سلسلے میں قرآن کی ان صفات پر بھی تفصیل پیش کی گئی ہے جو اسے انسانی کتابوں سے جدا اور ممتاز کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں پیش کی گئی تحاریر گوکہ ایسے تمام اعتراضات کا بھی تسلی بخش جواب مہیا کررہی ہیں جن میں یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ قرآن انسانی کلام ہے، کسی شاعر نے ترتیب دیا ہے، کسی کتاب سے کاپی شدہ ہے، محمد ﷺ نے خود گھڑ لیا ہے، پرانی کتابوں سے کاپی شدہ ہے وغیرہ' لیکن ہماری ارادہ یہ ہے کہ مستشرقین کے ایسے تمام مفروضوں جنھیں اب ملحدین اپنے ایک بڑے کارنامے اور تحقیق کے طور پیش کررہے ہیں ' کا بھی اتمام حجت کے لیے علیحدہ سے تحقیقی جائزہ پیش کردیا جائے۔

اس جائزے میں ہماری کوشش یہ رہی ہے کہ کسی مفروضے پر بحث کرنے کے بجائے بالکل تحقیقی انداز میں مکمل تاریخی حوالہ جات کے ساتھ ان بنیادی حقائق اور باتوں کو واضح کردیا جائے جنکو مستشرقین و ملحدین اپنا منجن بیچنے کے لیے مسخ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

مذہب کی ابتداء و تاریخ کے متعلق مختلف نظریات-ایک جائزہ

مذہب کے آغاز کے بارے میں دو بڑے نظریئے پائے جاتے ہیں۔ارتقائی نظریہ اور الہامی نظریہ۔

ارتقائی نظریہ

ڈارون کے نظریہ ارتقاء سے متاثر ہوکر مغربی محققین اور مستشرقین کی اکثریت نے مذہب کا ارتقائی نظریہ پیش کیا ہے۔جدید ماہرین کو چونکہ ہر چیز میں ارتقاء کی کارفرمائی نظر آتی ہے لہٰذا انہوں نے مذہب کے متعلق بھی ایسے ہی اندازے لگانے شروع کیے۔مذہب کے ارتقائی نظریہ کی رو سے انسان کی ابتداء جہالت اور گمراہی سے ہوئی۔ بعدازیں اس نے بتدریج مشرکانہ خدا پرستی اپنالی۔ان ارتقائی مراحل کی تفصیل میں کافی اختلاف ہے۔مثلاً: بعض محققین کا خیال ہے کہ مذہب کی ابتداء اکابر پرستی سے ہوئی جبکہ دوسروں کی رائے میں ابتداء مظاہر پرستی سے ہوئی۔ان کا خیال ہے کہ انسان نے ابتداء میں اپنی کم فہمی اور لاعلمی کی وجہ سے مظاہرِ فطرت کی پرستش شروع کردی۔ کیونکہ ابتدا میں اس کی زندگی و موت کا انحصار کافی حد تک ان پر تھا۔مثلاً: سیلاب، طوفان، زلزلے اور آتش فشاں وغیرہ، لیکن جوں جوں اس کا علم بڑھتا گیا اور جہالت دور ہوتی گئ تو اس نے محسوس کیا کہ یہ مظاہرِ فطرت خدائی قوتیں نہیں رکھتے۔ابتدا میں لوگوں نے ہر چیز کو دیوتا بنالیا لیکن علمی ترقی کے ساتھ ساتھ خداؤں کی تعداد میں کمی ہونے لگی حتیٰ کہ آخر میں صرف ایک خدا رہ گیا۔

جولین ہکسلے پہلا مغربی مفکر ہے جس نے ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو مذاہب کی تاریخ پر چسپاں کیا۔وہ لکھتا ھے :

”پہلے جادو پیدا ہوا، پھر روحانی تصرفات نے اس کی جگہ لے لی۔ پھر دیوتاؤں کا عقیدہ اُبھرا، بعد ازیں خدا کا تصور آیا۔اس طرح ارتقائی مراحل سے گزر کر مذہب اپنی آخری حد کو پہنچ چکا ہے۔“

نظریہ ارتقاء کا ابطال:

اس نظرے کے مطابق توحید جدید اور شرک قدیم ہے۔یہی بات نظریہ ارتقاء کے ابطال کے لیے کافی ہے۔تاریخ خود اس نظریئے کا ابطال کرتی ہے۔ مسیح علیہ السّلام سے ڈھائی ہزار برس قبل حضرت ابراہیم علیہ السّلام خالص توحید کے پرستار تھے اور مسیح علیہ السّلام سے دو ہزار برس بعد آج بھی نوعِ انسانی میں کروڑوں آدمی شرک کے پرستار ہیں۔علم اور انسان کی جدید تحقیق سے خود اکثر مغربی مفکرین بھی اب ارتقائی نظریہ کو چھوڑنے پر مجبور ہوگئے اور الہامی نظریہ کو ماننے پر مجبور ہوئے۔ چنانچہ پہلا محقق جس نے دریافت کیا کہ بہت خداؤں پر یقین رکھنے والے مذاہب بھی اصل میں ایک مذہب پر یقین رکھتے تھے' آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر سٹیفن لینگڈن تھے۔1931 میں انھوں نے اپنی اس دریافت کو دنیا کے سامنے بالخصوص سائنس کے شعبے سے تعلق رکھنے والوں کے سامنے پیش کیا۔اور یہ کہا کہ اس دریافت سے پتہ لگنے والی باتیں غیر متوقع ہیں اور ارتقاء کے حوالے سے دی جانے والی توجیجات کے منافی ہیں۔سٹیفن لینگڈن نے اپنی دریافت کی وضاحت اس طرح کی "۔۔انسانی تہذیب کی قدیم ترین تاریخ کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسان نے بہت تیزی سے ایک خدا کو ماننا چھوڑ کر بہت سے خداؤں اور بری ارواح کو ماننا شروع کردیا۔۔۔"

پانچ سال بعد سٹیفن لینگڈن نے سکاٹس مین میں کچھ یہ بیان دیا کہ:"شواہد بغیر کسی شک وشبہے کے ایک خدا کو ماننے کی طرف اشارہ کرتے ہیں،اہل یہود کی قدیم ترین کتابوں اور ادبی باقیات بھی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ اس زمانے کے لوگ ایک خدا پر یقین رکھتے تھے۔اور اب قدیم مذاہب اپنی ساکھ کھو چکے ہیں"۔

(Stephen H. Langdon, The Scotsman, 18 November1936)

3000 قبل از مسیحؑ سے تعلق رکھنے والے ایک شہر سمیرین کے علاقے تل اسمار کی کھدائی سے جو شواہد ملے ہیں وہ پروفیسر سٹیفن لینگڈن کی دریافت کی تصدیق کرتے ہیں۔کھدائی کے ڈائریکٹر ہنری فرینکفرٹ نے سرکاری طور پر یہ رپورٹ شائع کروائی:

"کھدائی کے دوران بہت سے واضح نتائج سامنے آئے ہیں جو قدیم مذاہب کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے مددگار ثابت ہوں گے۔ہمیں ایسی چیزیں دستیاب ہوئی ہیں جن کی بدولت ہم پہلی مرتبہ کسی مذہب کا اس وقت کے معاشرے کے مطابق مطالعہ کرسکتے ہیں۔

ہمیں عبادت گاہوں اور ان میں عبادت کرنے والوں کے گھروں سے ایک جیسے شواہد ملے ہیں۔ جن کی بدولت ہم کچھ نتائج اخذ کرسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس وقت کی مہروں کے اوپر مختلف خداؤں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ ان تصویروں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ یہ تمام تصویریں ایک خاص تصویر میں اکھٹی ہوتی ہیں جس میں اہم جگہ ایک خاص خدا کے لیے وقف ہے جس کی ان کی عبادت گاہوں میں بھی سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔"

(H. Frankfort, Third Preliminary Report on Excavations at Tell Asmar (Eshnunna): quoted by P. J. Wiseman in New Discoveries in Babylonia about Genesis, London: Marshall, Morgan and Scott, 1936, p. 24.)

فرینکفرٹ کی دریافت سے بہت سے اہم حقائق پتہ چلتے ہیں کہ کیسے ایک توہم پرستانہ اور بہت سے خداؤں پر ایمان رکھنے کا نظام قیام میں آیا۔

مذاہب کے ارتقاء کی تھیوری یہ دعویٰ کرتی ہے کہ بہت سے خداؤں کو ماننے کا تصور اس وقت عام ہوا جب لوگوں نے بری ارواح کو قدرتی طاقتوں کی نمائندگی بنا کر انکی پرستش شروع کر دی۔ جبکہ ایسا نہیں ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں نے خدا کی مختلف خوبیوں کے متعلق مختلف نظریات قائم کیے جس کی وجہ سے ایک خدا کے تصور میں بگاڑ پیدا ہونا شروع ہوگیا۔ ایک خدا کا تصور بہت سے خداؤں میں بدل گیا۔

لینگڈن کے سمیرین ٹیبلیٹس کے ترجمے سے بہت پہلے ایک محقق فرائیڈرک نے بھی اسی طرح کی دریافت کی۔ وہ تحقیق سے اس نتیجے پر پہنچا کہ قدیم مذاہب میں پائے جانے والے بہت سے خدا اس وقت کے ایک بڑے خدا **مدروک** کے مختلف کرداروں سے وجود میں آئے۔ تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ مدروک پر ایمان ایک خدا پر ایمان کی خرابی سے پیدا ہوا۔ اس خدا مدروک کے بہت سے نام تھے جیسے کہ نینیب (طاقت کا مالک)، نرگل (جنگ کا مالک)، بیل (حکمرانی کا مالک)، نیبو (پیغمبروں کا مالک)، سن یا رات کو روشن کرنے والا، شماش (تمام عدل کا مالک)، عبدو (بارش کا خدا)۔

وقت کے ساتھ مدروک کی ان صفات کو اس سے جدا کر دیا گیا اور مختلف خداؤں کو ان اختیارات کا مالک بنا دیا گیا۔ اسی طرح سورج دیوتا، اور چاند دیوتا جیسے خدا لوگوں کے تخیلات سے وجود میں آئے۔ مدروک پر یقین اور ساتھ ساتھ اسی خدا کے دوسرے ناموں پر یقین ایک خدا پر ایمان میں خرابی کی صورت میں پیدا ہوا۔ راہ راست سے ہٹنے کے اس جیسے شواہد ہمیں قدیم مصر میں بھی ملتے ہیں۔ محققین نے یہ دریافت کیا ہے کہ قدیم مصری پہلے ایک خدا پر یقین رکھتے تھے۔ لیکن وقت کے ساتھ وہ سورج کی پوجا میں لگ گئے۔

ایم۔ ڈی روژ لکھتے ہیں:

"یہ بات شک وشبہے سے بالاتر ہے کہ مصری مذہب کے پر شکوہ حصے وقت کے ساتھ ساتھ بہتری کی طرف نہیں بڑھے، بلکہ پر شکوہ حصے قدیم ہیں، اور جس حصے کو لاطینی اور یونانی مصنف سب سے پر شکوہ مانتے ہیں وہ دراصل قدیم مذہب کی سب سے بگڑی ہوئی صورت ہے۔"

ماہر آثار قدیمہ سر فلنڈرز پیٹری لکھتے ہیں کہ توہمات اور بہت سے خداؤں پر یقین ایک خدا کے تصور میں بگاڑ کی صورت میں پیدا ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے کہا کہ یہ بگاڑ آج کے اور ماضی کے تمام معاشروں میں دیکھا جاسکتا ہے، بعض نسلیں جیسے کہ ماڈرن ہندو بہت زیادہ خداؤں کی موجودگی پر خوشی مناتے ہیں اور ان خداؤں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ دوسری طرف بعض لوگ کسی عظیم خدا پر یقین نہیں رکھتے بلکہ بری ارواح اور شیاطین پر یقین رکھتے ہیں۔

اگر ایک خدا پر ایمان کا تصور بہت سے خداؤں، برائی کی طاقتوں کی پوجا سے ارتقاء کا نتیجہ ہوتا تو ہم ایک خدا کا مانا جانا بہت سے خداؤں کے مانے جانے کا نتیجہ دیکھتے۔ جبکہ شواہد اس کے برعکس ہے، شواہد اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ پہلے پہل ایک خدا کی پرستش کی جاتی تھی لیکن آہستہ آہستہ اس تصور میں خرابی سے بہت سے خداؤں پر یقین کا نظام وجود میں آتا گیا۔ (Sir Flinders Petrie, The Religion of Ancient Egypt, London: Constable, 1908, pp. 3, 4.)

پروفیسر شمٹ نے اپنی کتاب The Origin and Growth of Religion میں لکھا ہے:

"علم شعوب و قبائل انسانی کے پورے میدان میں اب پرانا ارتقائی مذہب بالکل بے کار ہوگیا ہے۔ نشوونما کی کڑیوں کا وہ خوش نما سلسلہ جو ان مذاہب نے پوری آمادگی کے ساتھ تیار کیا تھا، اب ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا اور نئے تاریخی رجحانوں نے اسے اٹھا کر پھینک دیا ہے۔ اب یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ

انسان کے ابتدائی تصور کی اعلیٰ ترین ہستی فی الحقیقت توحیدی اعتقاد کا خدائے واحد تھا اور انسان کا دینی عقیدہ جو اس سے ظہور پذیر ہوا وہ پوری طرح ایک توحیدی دین تھا۔" (The Origin and Growth of Religion، page 242)

مذاہب کے متعلق تاریخی مواد پر غور پر کریں تو معلوم ہوگا کہ کبھی کوئی قوم ان معنوں میں مشرک نہیں رہی ہے کہ وہ بالکل یکساں نوعیت کے کئی خدا مانتی ہو۔بلکہ انکے نزدیک تعدد آلہ کا مطلب ایک بڑے خدا کو مان کر کچھ اس کے مقربین خاص کا اقرار کرنا ہے جو ذیلی خداؤں کے طور پر کام کرتے ہیں۔شرک کے ساتھ ہمیشہ ایک خدا یا متعد خدا نگان کا تصور پایا جاتا رہا ہے۔ایسی حالت میں اوپر پیش کیا گیا ارتقائی مذہب کا استدلال ایک بے دلیل دعوی رہ جاتا ہے۔

مذہب کے متعلق اسی طرح اشتراکی مارکسی نظریہ تاریخ بھی موجود ہے ، یہ ان سے بھی زیادہ لغو ہے یہ نظریہ اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ اقتصادی حالات ہی وہ اصل عامل ہیں جو انسان کی تعمیر و تشکیل کرتے ہیں، مذہب جس زمانے میں پیدا ہوا وہ جاگیر داری اور سرمایہ داری نظام کا زمانہ تھا اب چونکہ جاگیر داری اور سرمایہ داری نظام استحصال اور لوٹ کھسوٹ کا نظام ہے اس لئے اس کے درمیان پیدا ہونے والے اختلاقی و مذہبی تصورات بھی یقینی طور پر اپنے ماحول ہی کا عکس ہوں گے اور وہ لوٹ کھسوٹ کے نظریات ہوں گے۔مگر یہ نظریہ علمی حیثیت سے کوئی وزن رکھتا ہے اور نہ تجربہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

یہ نظریہ انسانی ارادہ کی بالکلیہ نفی کر دیتا ہے اور اس کو صرف معاشی حالات کی پیدا وار قرار دیتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی اپنی کوئی ہستی نہیں جس طرح صابن کے کارخانے میں صابن ڈھلتے ہیں اسی طرح آدمی بھی اپنے ماحول کے کارخانے میں ڈھلتا ہے وہ الگ سے سوچ کر کوئی کام نہیں کرنا بلکہ جو کچھ کرتا ہے اسی طرح مطابق سوچنے لگتا ہے اگر یہ واقعہ ہے تو سوال یہ ہے کہ مارکس جو خود بھی سرمایہ دارانہ نظام کے اندر پیدا ہوا تھا اس کے لئے کس طرح ممکن ہوا کہ وہ اپنے وقت کے معاشی حالات کے خلاف سوچ سکے؟ کیا اس نے زمین کا مطالعہ چاند پر جاکر کیا تھا اگر مذہب کو پیدا کرنے والی چیز وقت کا اقتصادی نظام ہے تو مارکسزم بھی وقت کے اقتصادی نظام کی پیداوار کیوں نہیں ہے؟ مذہب کی جو حیثیت مارکسزم کو تسلیم نہیں ہے وہی حیثیت اس کے اپنے لئے کس طرح جائز ہو گی؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ نظریہ اشتعال انگریز حد تک لغو ہے اس کے پیچھے کوئی بھی علمی اور عقلی دلیل موجود نہیں۔ تمام مشہور پیغمبر اپنے دور کے ظلم پر مشتمل سرمایہ دارانہ نظام کو توڑنے ہی آئے ، حضرت موسیؑ ہوں یا ابراھیمؑ یا حضرت محمد ﷺ یہ اپنے دور کے ہر ظالم و جابر کے خلاف برسرپیکار رہے اور انہوں نے عدل ہی کی آواز لگائی۔

مذہب کا الہامی نظریہ

مذہب کاالہامی نظریہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانِ اوّل حضرت آدم علیہ السّلام کو جب دنیامیں بھیجاتواوّل روز سے ہی ان کی تمام مادی ضروریات کی طرح ان کی روحانی ضروریات یعنی دینی ہدایت کا بھی سامان کیا۔اس طرح انسانِ اوّل پوری طرح ہدایت یافتہ تھا۔ وہ نہ صرف توحید پرست تھابلکہ توحیدِ الٰہی کا پیغامبر تھا،انسانیت کو صراطِ مستقیم اور توحیدِ خالص سکھانے کے لیے وقفے وقفے سے ہر زمانے اور ہر قوم کی طرف رسول بھیجے گئے۔۔ مختصر یہ کہ ابتدائے آفرینش سے انسان کا اصلی مذہب توحید رہا ہے۔ شرک اس وقت پیدا ہواجب انسانی آبادی میں اضافہ اور پھیلاؤ ہوااور انبیاء کی تعلیم دھندلی پڑ گئی۔آج بھی غیر الہامی اور مشرک مذاہب ہندومت، جین مت، زرتشتی اور سکھ مت، بدھ مت اور افریقہ کے پرانے مذاہب وغیرہ میں الہامی تعلیمات کی ہلکی پھلکی جھلک دیکھی جاسکتی ہیں۔اس وقت موجود الہامی مذاہب عیسائیت، یہودیت اور اسلام ہیں، ان کے داعی اللہ تعالیٰ کے رسول اور پیغمبر تھے۔ان کی تعلیمات جزوی فرق سے خالص توحید پر مبنی تھیں، لیکن بعد میں عیسائیت اور یہودیت کے پیروکاروں نے اپنے مذاہب میں من مانی ترامیم اور تحریفات کرلیں۔

الہامی وغیر الہامی مذاہب

مذاہبِ عالم کو الہامی اور غیر الہامی میں تقسیم کیا جاتا ہے۔الہامی سے مراد وہ ادیان ہیں جو خدا، اس کے رسولوں اور ان کی لائی ہوئی کتابوں پر یقین رکھتے ہیں۔اس کے برخلاف غیر الہامی سے مراد وہ ہیں جو اپنی تعلیمات اور عقائد کو خدائے وحدہٗ لاشریک کی معیّن ہدایات کے تابع نہیں سمجھتے۔الہامی مذاہب میں یہودیت، عیسائیت اور اسلام، جبکہ غیر الہامی میں بقیہ مذاہب آتے ہیں۔ الہامی مذاہب کو سامی مذاہب بھی کہتے ہیں ، سامی مذاہب سے

مراد وہ مذاہب جو سام بن نوح کی اولاد سے تعلق رکھتے ہیں۔الہامی مذاہب سامی نسل سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ان مذاہب اور خصوصاً اسلام کا عقیدہ صرف سامی نسل کے لوگوں تک محدود رہا یا سامی نسل کی برتری پر مبنی ہے ،ان مذاہب کے سامی النسل ہونے کا منشاء صرف اس قدر ہے کہ ان مذاہب کے انبیاء سامی اقوام میں آئے۔ورنہ یہ تینوں سامی مذاہب آج عالمگیر اور دنیاکے ہر براعظم میں پائے جاتے ہیں

غیر الہامی مذاہب کو منگولی اور آریائی مذاہب بھی کہا جاتا ہے ، تاؤازم،شنوازم،بدھ مت اور کنفیوشزم ،یہ تمام مذاہب منگول قوم کی طرف منسوب ہیں۔بعض علماء بدھ مت کو آریائی مذاہب میں شمار کرتے ہیں اور بعض منگولی مذاہب میں شمار کرتے ہیں (ہندومت، جین مت، سکھ مت اور زرتشت یہ تمام مذاہب کی نسبت آریہ قوم کی طرف منسوب ہیں)

الہامی و غیر الہامی مذاہب کا تقابل: -

الہامی مذاہب اصلاً ایک خدا کے تصور پر مبنی ہیں، یہ مذاہب پیغمبروں کے قائل ہیں، مذاہب کا اصل منبع و سرچشمہ سماوی ہیں، مشرقِ وسطیٰ سامی اقوام سے ابتدا ہوئی اور اپنی تعلیمات کی تبلیغ کے باعث باہر بھی پھیلے۔

غیر الہامی مذاہب ایک تصور خدا کے پابند نہیں، بعض سرے سے خدا کے تصور سے بھی عاری ہیں، تعلیمات کا سرچشمہ سماوی نہیں رہا، ان میں پیغمبروں کا تصور ختم ہوچکا ہے ، ان کا علاقہ وہ ہے جہاں بعد میں سامی مذاہب کی تبلیغ نہیں ہوسکی۔

تعلیمات کے لحاظ سے بھی ان میں فرق ہے ، الہامی مذاہب اپنی تعلیمات یا عملی تاریخ کے باعث تبلیغی ہیں اور غیر الہامی اپنی اصلی تعلیمات کے مطابق تبلیغی نہیں۔

اس طرح الہامی مذاہب کی تعلیمات معیّن اور واضح ہیں لیکن غیر الہامی مذاہب کی تعلیمات غیر معیّن اور لچکدار ہیں۔مزید الہامی مذاہب کی تعلیمات کلّی ہیں اور اپنی اصل کی بنا پر دینی اور دنیوی زندگی پر کم و بیش حاوی ہیں، لیکن غیر الہامی مذاہب کی تعلیمات جزوی ہیں یعنی یا تو صرف روحانی زندگی سے متعلق ہیں جیسے تاؤمت یا پھر دنیوی زندگی سے متعلق ہیں جیسے کنفیوشسی مت۔

آسمانی/ الہامی مذاہب :

انبیاء کرام کے ایک طویل و مدید سلسلہ کی ابتدا حضرت آدمؑ سے ہوئی اور انتہاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوئی ، اس بڑی لمبی و طویل مدت کے درمیان انسانی زندگی کو سنوارنے کے لئے تقریباً کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام اس صفحہ ہستی پر تشریف لائے اور سب کا مشن بندوں کے مابین اللہ کی ذات کا تعارف، اور اس کے ہر چھوٹے بڑے حکم کو بجالانا تھا۔خود قرآن کریم میں تقریباپچیس انبیاء کے اسمائے گرامی کا تذکرہ ہے۔ مثلاً آدم، نوح، موسیٰ، ابراہیم، اسحاق، اسماعیل، داؤد، سلیمان، عیسیٰ علیہم السلام اور حضرت محمد (ﷺ)۔مگر احادیث کے مطابق ایک لاکھ 24ہزار پیغمبر مبعوث کیے گئے۔حضرت محمد ﷺ سے قبل آنے والے پیغمبروں کا دور اپنی قوم تک محدود تھا اور ان کی تعلیمان بھی ایک قوم اور ایک وقت کیلئے مخصوص تھیں ان کی کتابیں اور شریعت بھی ایک محدود زمانے تک قابل عمل تھی ، خود انجیل کی شہادت اس سلسلے میں موجود ہے " میں نہیں بھیجا گیا مگر اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کی طرف" (بائبل، انجیل متی، 24:15)اس لئے یکے بعد دیگرے کتابیں بھی اتاری جاتی رہیں اور نبی اور رسول بھی بھیجے جاتے رہے اور سابقہ کتابیں منسوخ ہوتی رہیں، تاآنکہ رسول اللہ کو آخری نبی اورآخری کتاب دے کر بھیجا گیا اور دین و شریعت کی تکمیل کردی گئی۔

اس وقت موجود الہامی مذاہب عیسائیت، یہودیت اور اسلام ہیں، ان کے داعی اللہ تعالیٰ کے رسول اور پیغمبر تھے۔ان کی تعلیمات جزوی فرق سے توحید پر مبنی ہیں اور انکا منبع ایک ہی ہے۔ان تینوں مذاہب کے پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کی اولاد سے ہیں ، حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹے تھے۔حضرت اسحٰقؑ اور حضرت اسماعیلؑ۔حضرت اسحٰقؑ اور انکے بیٹے حضرت یعقوب بھی پیغمبر تھے ، حضرت یعقوبؑ کا نام اسرائیل بھی تھا اور اسی سے انکی نسل کو بنی اسرائیل کہا جاتا ہے۔حضرت اسماعیلؑ مکہ میں آکر آباد ہوئے اور انکی اولاد میں صرف حضرت محمد ﷺ کو نبوت ملی۔

عام باشندگانِ عرب شروع سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں دینِ ابراہیمی کے پیرو تھے تاآنکہ بنو خزاعہ کا سردار عُمر و بن لُحَیٰ منظر عام پر آیا۔اس کی نشوونما بڑی نیکوکاری ، صدقہ وخیرات اور دینی امور سے گہری دلچسپی پر ہوئی تھی۔اس لیے لوگوں نے اسے محبت کی نظر سے دیکھا اور اسے اکابر علماء اور افاضل اوّلیاء میں سے سمجھ کر اس کی پیروی کی۔اس شخص نے ملک شام کے سفر میں بتوں کی پوجا دیکھی تو اس نے سمجھا کہ یہی بہتر اور بر حق ہے کیونکہ ملک شام پیغمبروں کی سر زمین اور آسمانی کتابوں کی نزول گاہ تھی۔چنانچہ وہ اپنے ساتھ ہبل بت بھی لے آیا اور اسے خانہ کعبہ کے اندر نصب کر دیا اور اہل مکہ کو اللہ کے ساتھ شرک کی دعوت دی۔اہل مکہ نے اس پر لبیک کہا۔اس کے بعد بہت جلد باشندگان حجاز بھی اہل مکہ کے نقش قدم پر چل پڑے۔کیونکہ وہ بیت اللہ کے والی اور حرم کے باشندے تھے۔اس طرح عرب میں بت پرستی کا آغاز ہوا اور اس کے بعد حجاز کے ہر خطے میں شرک کی کثرت او ر بتوں کی بھر مار ہو گئی۔ ہبل سرخ عقیق سے تراشا گیا تھا۔ صورت انسان کی تھی۔ یہ مشرکین کا پہلا بت تھا اور ان کے نزدیک سب سے عظیم اور مقدس تھا۔ (کتاب الاصنام لابن الکلبی ص ۲۸)

قبل از اسلام عرب میں حنیفیت (دین ابراهیمی)

بعثت محمد ﷺ سے پہلے عرب میں ایک رواجی دین کا چرچا تھا، اس کی بنیاد دین ابراہیمی پر تھی۔ وہ خالص دین اسلام تھا جو تمام پیغمبران وقت لاتے رہے لیکن اس خالص دین ابراہیمی میں رفتہ رفتہ بہت سی بدعات و خرافات شامل ہوتی گئیں اور وہ مسخ ہوگیا، اس دین کو بگاڑنے والے اسبب و محرکات اور عناصر میں شرک کا تصور سب سے زیادہ کارگر رہا، اس نے اللہ واحد کے عقیدہ کو دھندلا کردیا اور معبودِ حقیقی کے ساتھ بعض عناصر و اشیاء کی عبادت شامل کردی۔ حضرات موسیٰ (علیہ السلام) و عیسیٰ (علیہ السلام) کے دین بھی دین ابراہمی کا تسلسل اور دین اسلام کی عصری صورتیں تھیں، وہ بدعات و انحرافات کی بناء پر اپنے صحیح جادہء اسلامی سے کج ہوکر رواجی یہودیت اور مسیحیت میں ڈھل گئے تھے۔

(ابن هشام 1/14-35 و مابعد 240-241 و مابعد، سہیلی، الروض الانف ، متعلقہ مباحث، السید محمود شکی الآلوسی، بلاغ الاررب فی معرفۃ احوال العرب، تحقیق محمد بہجۃ الاثیری، دار الکتاب العربی، قاہرہ 1342ء طبع سول، 2/240-241 وغیرہ، جواد علی، تاریخ العرب قبل السلام، مطبعۃ المجمع العلیمی العراقی، بغداد 1956ء 6/6-50 (یہودیت) 51-88 (نصرانیت) وغیرہ)

اکثریت کے رواجی دین کے خلاف صالح روحوں اور پاک ذہنوں میں احتجاجی لہرین اٹھتی رہیں، بالعموم ایسا سمجھا جاتا کہ شرک اور مشرکانہ روایات و رسوم کے خلاف بعثت محمدی سے کچھ قبل ہی رد عمل شروع ہوا، مولانا شبلی نعمانی (رحمۃ اللہ علیہ) کا خیال ہے کہ "۔۔اس بناء پر بت پرستی کی برائی کا خیال بہتوں کے دل میں آیا، لیکن اس کا تاریخی زمانہ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے کچھ ہی پہلے شروع ہوتا ہے۔۔" (سیرۃ النبی، معارف پریس اعظم گڈھ، 1983ء، 1/124) بیشتر سیرت نگاروں نے اسے " حنیفیت " کے نام سے یاد کیا ہے اور اس کا نقطہء آغاز بعثت کے قریب مانا ہے، کئی اہل قلم نے دین حنیفی کو صرف مکہ مکرمہ تک محدود مانا ہے اور اسے صرف ایک علاقائی رد عمل بنا دیا ہے۔ اس مطالعہ کے مقصد عرب میں حنیفیت کی تاریخ، حدود و اثرات کا پتہ لگانا اور قارئین کے سامنے پیش کرنا ہے۔

جدید اردو سیرت نگاروں میں مولانا شبلی نعمانی (رحمۃ اللہ علیہ) حنیفیت کی تاریخ و وسعت و اثر سے سب سے زیادہ واقف تھے، " ابن ہشام نے بت پرستی کی مخالفت کرنے والوں میں چارکا نام لکھا ہے لیکن اور تاریخی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب میں اور متعدد اہل نظر پیدا ہوگئے تھے جنہوں نے بت پرستی سے توبہ کی تھی۔" (1/125-126) انہوں نے چند دوسرے احناف کا ذکر مختلف روایات و اخبار کی سند پر کیا ہے اور ان کا بیان اپنے مقام پر آتا ہے۔

شبلی (رحمۃ اللہ علیہ) کی فراہم کردہ طرز تحقیق پر سید ابو الاعلی مودودی (رحمۃ اللہ علیہ) نے مزید تحقیقات کیں اور حقیقی حنیفیت کے رجحان اور اس سے متاثر افراد کے بارے میں مزید معلومات بیان کیں، ان کا ایک اقتباس نقل کرنے کے لایق ہے۔

" عرب کا اصل دین دینِ ابراہیمی تھا اور بت پرستی ان کے ہاں عمر بن لحی نامی ایک شخص نے شروع کی تھی، شرک و بت پرستی کے رواج عام کے باوجود عرب مختلف حصوں میں جگہ جگہ ایسے لوگ موجود تھے جو شرک کا انکار کرتے تھے، توحید کا اعلام کرتے تھے اور بتوں پر قربانیاں کرنے کی علانیہ مذمت کرتے تھے، خود نبی ﷺ کے عہد سے بالکل قریب کے زمانے میں قیس بن ساعد الایادی، امیہ بن ابی الصلت، سوید بن عمر المصطلقی، وکیع بن سلمہ بن زہیر الایادی، عمر بن جندب الجہنی، ابوقیس حرمہ بن ابی انس، زید بن عمر بن نفیل، ورقہ بن نوفل، عثمان بن الحویرث، عبید اللہ بن جحش، عامر بن الظرب العدوانی، علاف بن شہاب التمیمی، المتلمس ابن امیہ الکنانی، زہیر بن ابی سلمیٰ، خالد بن سنان بن غیث العبسی ، عبداللہ القضاعی اور ایسے ہی بہت سے لوگوں کے حالات ہمیں تاریخوں میں ملتے ہیں جنہیں " حنفاء " کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ، یہ سب لوگ علی الاعلان توحید کو اصل دین کہتے تھے اور مشرکین کے مذہب سے اپنی بے تعلّقی کا صاف صاف اظہار کرتے تھے، ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے ذہن میں یہ تخیل انبیاء (علیہ السلام) کی ساری تعلیمات کے باقی ماندہ اثرات ہی سے آیا تھا۔ (تفہیم القرآن، مرکزی مکتنہ اسلامی، دہلی 1984ء 4/37، سیرت سرور عالم، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، 1989، 2/70-72) سید مودودی نے اپنی کتاب سیرت میں بعض سے متعلق کچھ تفصیلات بھی دی ہیں۔

شبلی (رحمۃ اللہ علیہ) اور مودودی (رحمۃ اللہ علیہ) کی تحقیقات کو آگے بڑھاتے ہوئے جاہلی دور میں حنیفیت کا مطالعہ زیادہ سود مند ہوگا، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جزیرہ نمائے عرب کے مختلف خطوں اور ان کے قبیلوں میں موجود احناف کا ذکر خطہ، بہ خط یا قبیلہ بہ قبیلہ کیا جائے تاکہ حنیفیت کا دائرہ اثر واضح ہوسکے اور اس سے زیادہ یہ حقیقت اجاگر ہوسکے کہ وہ ایک عارضی اور مقامی رجحان نہیں تھا، بلکہ ایک قومی مزاج اور دین ابراہیمی کا اظہار تھا اور وہ ہر زمان و مکان میں پایا جاتا رہا، ڈاکٹر جواد علی نے اپنی کتاب میں احناف عرب پر ایک خاص باب باندھا جس میں اسکی تاریخ ہے۔
(تاریخ العرب قبل السلام، مطبعۃ المجمع العلمی العراقی، بغداد 1956ء، 284/6-322: الفصل السادس: المجوس و الاحناف)
مولانا مودودی کا یہ تجزیہ بالکل صحیح ہے کہ " یہ بھی رسالتِ اسماعیلی کا اثر ہی تھا کہ بعثتِ محمدی کے وقت تک عرب میں ایسے لوگوں کا ایک گروہ موجود رہا جنھیں تاریخ میں حنفاء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے" (سیرت 71/2)، اس پر صرف یہ وضاحتی تبصرہ کافی معلوم ہوتا ہے کہ حضرات ابراہیم (علیہ السلام) و اسماعیل (علیہ السلام) کے مبارک زمانے سے دینِ ابراہیمی اور دینِ السام کا رواج عربوں میں رہا اور جب جاہلیت نے اس اصل دین کو مسخ کیا تب بھی اس کے بہت سے احکام و رسوم اور اعمال و مناسک عربوں میں برقرار و جاری رہے، توحید الٰہی اور اصل دین کے عقائد و ارکان پر ایمان و عمل بھی ان میں سے تھا جو بہت سے علاقوں میں ہمیشہ سے پایا جاتا رہا، دین ابراہیمی کے باقیاتِ صالحات پر شاہ ولی اللہ دہلوی، سید مودودی، شبلی نعمانی اور متعدد دوسرے اہل قول نے تفصیل سے لکھا ہے جو سرِ دست زیر بحث نہیں، حنیفیت زیر بحث ہے اور اس کی تاریخ۔

حنیفیت کے معنی :

مولانا شبلی کا خیال ہے کہ چوں کہ اس دین میں بت پرستی سے انحراف تھا، اس لیے اس کو حنیفی کہتے ہیں، کیوں کہ " حنف " کے معنی انحراف کے ہیں۔۔(126/1 بلا حوالہ مصادر)۔

مولانا مودودی نے حنیفیت سے مراد توحید الٰہی اور شرک و بت پرستی سے گریز کو لیا ہے (تفہیم 36/4-37 و مابعد سیرت 70/2-71 و مابعد ، آلوسی جواد علی اور دوسرے اہل قولم، نیز بحث آیندہ بر عقاید و اعمالِ احناف)۔

ابنِ اسحاق نے حضرت سلمان فارسی کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے صحیح دین کی تلاش میں ترکِ وطن کیا، اپنے وطن ایران سے سفر کرتے ہوئے شام پہنچے تو شامی راہب و عالم سے حنیفیت یعنی دین ابراہیمی کے بارے میں سوال کیا، اس مردِ دانا نے کہا کہ یہ وہ سوال ہے کہ لوگ آج کل نہیں پوچھا کرتے، زمانہ آگیا ہے کہ ایک نبی اس دین کے ساتھ مبعوث ہوگا، ان کے پاس جاؤ وہ تم کو اس کے حامل بنا دیں گے، "۔"(ابن ہشام، السیرہ و النبویہ، متربہ محی الدین عبدالحمید، دار الفکر، قاہرہ 1937ء 241/1)۔

ابن اسحاق و ابن ہشام نے اس کے بعد مکہ مکرمہ کے چار مشہور و معروف حنفاء کا ذکر کرکے لکھا ہے کہ وہ قریش کی رواجی بت پرستی اور عام دین چھوڑ کر اصل دین ابراہیم کی تلاش و جستجو میں مختلف علاقوں میں پھیل گئے، کیوں کہ ان کی قوم کسی اصل پر قایم نہ تھی او وہ اپنے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین سے دور جا پڑے تھے، جن پتھروں کا وہ طواف کرتے تھے وہ سنتے تھے نہ دیکھتے تھے، نقصان پہنچاتے تھے اور نہ نفع، لہٰذا اصل دین تلاش کرو " (242/1)

حضرت زید بن عمر بن نفیل عدوی:

ان چار وں باشند گانِ مکہ میں حضرت زید بن عمر بن نفیل عدوی کے دین کی مزید تفصیل سے حنیفیت کا دائرہ شرک و بت پرستی سے آگے بڑھ کر پورے دین ابراہیمی کو حاوی ہوجاتا ہے، ابن اسحاق کا مزید بیان ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کے دین کو ترک کیا، بتوں، مردہ گوشت خون اور بتوں کے چڑھاوے کے جانوروں کے ذبیحہ سے اجتناب کیا، نومود بچیوں کے قتل سے لوگوں کو روکا اور کہا کہ میں ابراہیم (علیہ السلام کے رب کی عبادت کرتا ہوں، "۔۔۔۔ وفارق دین قومہ، فاعتزل الاوثان و المیتۃ و الدم و الذبائح التی تذبح علی الاوثان و نهی عن قتل الموؤدۃ، وقال: عبد رب ابراہیم۔۔ ۔۔۔۔" (244/1) فتح الباری، ریاض 1997، 183/7-184)۔

حضرت زید بن عمر بن نفیل عدوی کے دین ابراہیمی پر گامزن ہونے اور حنیفیت کے معنی دین ابراہیمی ہونے کا اظہار اسحاق کی ایک اور روایت سے ہوتا ہے۔وہ کعبہ کی جانب ٹیک لگائے قریش سے فرمایا کرتے تھے " اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں زید بن عمرو کی جان ہے میرے علاوہ تم میں اور

کوئی دین ابراہیم پر باقی نہیں ہے"، پھر فرماتے: " اے اللہ ! اگر میں جانتا ہوں کہ تجھے کون سا طریقہ سب سے زیادہ پسند ہے تو میں اسی کے مطابق تیری عبادت کرتا لیکن میں اسے نہیں جانتا، پھر وہ اپنے پہلو پر سجدہ کرتے"، (244/1) امام بخاری کی روایت میں یہی بات دوسرے الفاظ میں ہے"

۔۔۔۔۔ واللہ ما منکم علی دین ابراہیم غیری" (کتاب مناقب الانصار، باب حدیث زیدبن عمرو بن نفیل)۔

اسحاق کی ایک اور روایت میں حنیفیت کو دین ابراہیمی کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ وہ بھی حضرت زید بن عمر بن نفیل کے حوالے سے ہی ہے، حضرت زید کی اہلیہ صفیہ بنت الحضرمی تھیں، حضرت زید جب بھی مکہ سے جانے اور بلادِ ارض میں حنیفیت ، ابراہیمی دین کو تلاش کرنے کے لیے سفر کرنے کا تہیہ کرتے وہ ان کے چچا اور ماموں کے بھائی خطاب بن نفیل عدوی کو اطلاع کردیتی اور وہ ان کو اپنی قوم کے دین کے چھوڑنے پر عتاب کرتے رہتے۔" ۔۔۔۔۔وکان زید بن عمرو قد اجمع الخروج من مکۃ لیضرب فی الارض یطلب الحنیفیۃ دین ابراہیم علیہ السلام فکانت صفیۃ بنت الحضرمی کلما رأتہ قد تھیأ للخروج و ارادہ اذنت بہ الخطاب بن نفیل، وکان الخطاب بن نفیل عمہ و اخاہ لامہ، وکان یعاتبہ علی فراق دین قومہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " (1۔247)

دین ابراہیم علیہ السلام کی تلاش میں بالآخر وہ مکہ سے نکل ہی گئے، وہ راہبوں اور احبار سے پوچھتے پوچھتے موصل و جزیرہ کا چکر لگاتے ہوئے شام پہنچے اور اس کو کھنگال ڈالا تا آنکہ وہ ارضِ بلقاء میں میفعہ میں ایک راہب سے جا ملے جو نصرانیوں کا سب سے بڑا عالم سمجھا جاتا تھا اور اس سے جیسا کہ راویوں کا گمان ہے حنیفیت دینِ ابراہیم کے بارے میں پوچھا اور اس نے بتایا کہ ان کے اپنے وطن میں ایک نبی دین ابراہیم حنیفیت کے ساتھ مبعوث ہوگا، " " (250-249/1) بخاری حدیث نمبر: 3827

حنیفیت کو دین ابراہیم علیہ السلام بتانے والی ابن اسحاق کی روایت کو امام بخاری نے اپنی سند سے بیان کیا ہے، اس کے مطابق شامی عالم سے جب حضرت زید نے صحیح دین کے بارے میں پوچھا تو عالم نے کہا کہ اسے حنیف ہونا چاہیئے، حضرت زید کے سوال پر کہ حنیف کیا ہے، یہودی عالم نے کہا کہ دین ابراہیم ، وہ یہودی تھے اور نصرانی، وہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہیں کیا کرتے تھے اور ایک عیسائی / نصرانی نے بھی یہی تعریف حنیف اور دین ابراہیم کی کی تھی، دونوں جگہ یکساں تعبیرات ہیں حضرت زید نے حضرت ابراہیم کے بارے میں جب ان کے اقوال سنے تو برجستہ ہاتھ اٹھا کر فرمایا تھا کہ " اے میرے اللہ ! میں گواہی دیتا ہوں کہ میں حضرت ابراہیم کے دین پر ہوں۔۔"

" ۔ قال: ما اعلمہ الا ان یکون حنیفا، قال زید: وما الحنیف؟ قال دین ابراہیم ، لم یکن یہود یا ولا نصرانیا ولا یعبد الا اللہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فلما رأی زید قولھم فی ابراہیم علیہ السلام خرج فلما برز رفع یدیہ فقال: اللھم انی اشھد انی علی دین ابراہیم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" (کتاب مناقبت الانصار، باب حدیث زید بن عمر بن نفیل، حدیث 3827 بہ سند حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالی عنہ ابن حجر، فتح الباری، 180/7-183 اوما بعد)۔

حافظ ابن حجر نے اولین حدیث بخاری: " ما منکم علی دین ابراہیم غیری " میں ابو اسامہ کی روایت میں موجود اضافہ نقل کیا ہے، حضرت زید کہا کرتے تھے کہ میرا اللہ ابراہیم کا اللہ ہے اور میرا دین ابراہیم کا دین ہے،" وکان یقول: الٰہی الہ ابراہیم و دینی دین ابراہیم۔۔۔۔۔"انہوں نے ابن ابی زناد اور ابن اسحاق کی روایات بھی مختصراً نقل کی ہیں جن میں عبادتِ اصنام اور بتوں کے چڑھاوے سے ان کے اجتناب کا ذکر کیا گیا ہے، (183/7) شاہ ولی اللہ دہلوی نے حضرت زید کے اشعار کے ذریعہ حکما و افاضل عرب کے اثبات توحید کا ذکر کیا ہے:

۔ ۔ ۔ وجدت افاضلھم و حکمانھم کانو یقولون بالمعاد و بالحفظۃ و غیر ذلک و یثبتون التوحید علی وجبہ حتی قال زید بن عمرو بن نفیل فی شعرہ:

عبادک یخطئون و انت رب
یکفیک المنایا و الغلوم
أربا واحد ام الف رب
ادین اذا یقسمت الامور
رکت اللات و العُزی جمعیا
کذلک یفعل الرجل البصیر
(حجۃ اللہ البلاغۃ، 277/1)

مردہ جانور (میتۃ) کی مانند بتوں کی بھینٹ بھی دین ابراہیم میں حرام تھی، بخاری کی حدیث کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ سے (وادی) بلدح کے نشیبی علاقہ میں ملاقات ہوئی، یہ قصہ نزول وحی سے پہلے کا ہے، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک

دستر خوان بچھایا گیا تو زید بن عمرو بن نفیل نے کھانے سے انکار کر دیا اور جن لوگوں نے دستر خوان بچھایا تھا ان سے کہا کہ اپنے بتوں کے نام پر جو تم ذبیحہ کرتے ہو میں اسے نہیں کھاتا میں تو بس وہی ذبیحہ کھایا کرتا ہوں جس پر صرف اللہ کا نام لیا گیا ہو،(باب: زید بن عمرو بن نفیل کا بیان ،حدیث نمبر: 3826)

خطابی کا قول ہے کہ نبی ﷺ اصنام پر ذبح کیا ہوا جانور نہیں تناول فرماتے تھے اور باقی ذبیحہ قریش کھا لیا کرتے تھے (362/2)، یہ نکتہ تحقیق طلب ہے کہ مشرکین مکہ و عرب اپنے جانوروں کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیتے تھے یا نہیں؟ روایات کا درو بست بتاتا ہے کہ وہ عام ذبائح پر نام الٰہی لیتے تھے کہ وہ سنت ابراہیمی تھی۔(جیسا کہ واضح ہے کہ یہ معاملہ وحی کے آنے سے پہلے کا تھا.. حضورﷺ کا عمل بطور مقتداء وحی آنے کے بعد واجب العمل ہے، نہ کہ پہلے کا.. تاہم اس روایت سے آپﷺ کی ذات پر ایک گونہ حرف آتا ہے کہ گویا کہ زمانہ قبل نبوت میں آپﷺ بتوں کے چڑھاوے کھایا کرتے تھے..حلانکہ اس روایت میں ایسی کوئی چیز مذکور نہیں کہ یہ شے بتوں کا چڑھاوہ ہی تھی..زید چونکہ اس معاملے میں بہت شدت پسند تھے، لہٰذا ان لوگوں کے ہاتھوں سے بھی کھانا پسند نہ کیا، جو چڑھاوے پیش کیا کرتے تھے..مگر چونکہ یہ بے جا سختی کے علاوہ کچھ نہیں اور کام نہیں ہے، لہٰذا آپﷺ ان کے حلال ذبیحے کھایا کرتے تھے..جیسا کہ اس موقع پر کھایا..)

ابن ہشام نے اپنی تشریح میں حنفیت کی ایک دوسری جہت بتائی ہے، ان کے مطابق عرب " تحنث و تحنف " ایک معنی میں استعمال کرتے تھے، " تحنث " دراصل " تحنف " ہے اور " ف" کو "ث " سے بدل دیا کرتے تھے، اور اس سے مراد حنفیت لیتے تھے، " تسال ابن هشام: تقول العرب: التحنث و التحنف، يريدون الحنفية، تيعبدون لون الفاء من الثاء ـ ـ ـ ـ ـ " (254/1)

انہوں نے کلامِ عرب سے اس کی بعض مثالیں بھی پیش کی ہیں، اس سے کچھ پہلے ابن اسحاق کی یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اکرم ﷺ ہر سال ایک مال غارِ حراء میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے اور یہ وہ تحنث اور نیکی کا کام تھا جو قریش جاہلیت میں کیا کرتے تھے، "
(و التحنث : التبرر)ـ ـ ـ ـ ـ" (253/1، 380/2، 390-392)

امام طبری نے سورۃ بقرہ 135 میں وارد الفاظ الٰہی " ملة ابراہیم حنيفا " کی تفسیر میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم کا دین حنیفیت مسلمہ تھا جس پر بعد کی تمام دوسری ملتوں اور مذہبوں کا مدار تھا: " فان دينه كان الحنيفية المسلمة ـ ـ ـ ـ ـ " (جامع البيان عن تاويل آى القرآن / تفسير الطبرى، مترجم محمود شاكر، بيروت 2001، 253/1)

زمخشری نے اس آیت کریمہ کی تاویل میں حنیف کے صرف لغوی معنی سے بحث کی ہے کہ ہر باطل دین سے کٹ کر دین حق ہو جانے والا حنیف ہوتا ہے اور اس کا مصدر حنف ہے انہوں نے استشہاد میں ایک شعر بھی نقل کیا ہے۔:" و الحنيف: المائل عن كل دين باطل الى دين الحق ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ " (الكشاف، مرتبہ عبدالرزاق المهدى، بيروت 1997ء، 220/1)۔

سورۃ آل عمران 95 میں ملة ابراہیم سے (413/1) تعبیر کیا ہے۔(سورۃ نساء 125، انعام 79، 161 ،۔یونس 105، نحل 120، 123، روم 30، حج 31، بینہ 5) ابن منظور نے تحنث کے معنی " تعبد و اعزل الاصنام " لکھے ہیں اور اسے تحنف کے مثل قرار دیا ہے۔(لسان العرب ماده حنث)
انہوں نے تحنف / حنف کو الگ سے بحث کے قابل نہیں سمجھا کہ وہ تحنث ہی کا مترادف ہے ، حدیث نبوی کی تشریح بھی اسی طرح کی ہے، صحیح حدیث میں ملت اسلام کے لیے " الحنيفية السميحة " کی ترکیب آئی ہے: " الحنيفية السمحة السهلة " (مقالہ " حنيف " دایره معارف اسلامیہ، لاہور از اداره ، ابن اثیر، اسد الغابہ، 72/1: احب الاديان الى الله الحنيفية السمحة ـ ـ ـ ـ ـ)

ڈاکٹر جواد علی نے حنفاء اور احناف کی تعریف میں لکھا ہے کہ مسلمان حنفاء سے ان لوگوں کو مراد لیتے ہیں جو جاہلی عربوں میں سے دین ابراہیم پر قایم تھے اور انہوں نے اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا تھا، نہ وہ یہودیت میں داخل ہوئے اور نہ نصرانیت میں اور نہ ہی انہوں نے بتوں کی پوجا کو ایک دین سمجھا بلکہ اس پرستش پر طعن کیا اور اس کے قائلین پر تنقید کی، اہل اخبار بیان کرتے ہیں کہ تمام جاہلی عرب قحطان و عدنان کے عمر بن لحہ الخزاعی سے پہلے اس دین پر تھے وہ موحدین تھے صرف اللہ جل جلالہ کی عبادت کرتے تے، نہ اس کے ساتھ شرک کرتے تھے، اور نہ اس کے حقوق سے غفلت کرتے:"ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ و يقصد المسلمون بالحنفاء من كانو على دين ابرابيم من الجاهلين، فلم يشركو ابربهم احد الم يدخلو فى يهودية ولا نصرانية ولم يقبلو لعبادة الاصنام دينا بل سفهوا تلك العبادة و سفهوا راى القائلين بها و يذكر اهل الاخبار ان الجاهلين جميعا من قحطان

و عدنان كانو قبل عمرو بن لحی الخزاعی علی هذا الدین كانو موحدين يعبدون الله جل جلاله وحده لا يشركون به ولا ينتقصونه ـ ـ ـ ـ ـ " (تاريخ العرب قبل الاسلام، 289/6)

انھوں نے حاشیہ میں سورۃ بقرہ 135 : " بل ملة ابراہیم حنيفا " کی تشریح میں ابوعبیدہ کا قول نقل کیا:

" من كان علی دين ابراہيم فهو حنيف عند العرب و كان عبدة الاوثان فی الجاهلية يقلون نحن حنفاء علی دين ابراہيم فلما جاء الاسلام سموا المسلم حنيفا"۔

اخفش کا قول بھی اس کے بعد نقل کیا ہے:

" ـ ـ ـ ـ ـ الحنيف المسلم و كان فی الجاهلية يقال: من اختتن و حج البيت حنيف لأن العرب لم تتمسک فی الجاهلية بشنی من دين ابراہيم غير الختان و حج البيت فكل من اختتن و حج قيل له حنيف فلما جاء الاسلام تمادت الحنيفية فالحنيف المسلم" (تاريخ العرب قبل السلام، 290/6) حاشیہ نمبر 1 بحوالہ اللسان 403/10، و ما بعدها، بلوغ الارب، 95/2 اوما بعدها)۔

محقق گرامی نے بہ جا طور سے لکھا ہے کہ عمرو بن لحہ کی دعوت عرب میں خوب پھیلی اور پروان چڑھی کہ اکثر لوگ اس میں داخل ہوگئے کیوں کہ گمراہی جلدی پھیلتی ہے اور دین ابراہیمی کی حفاظت کرنے والے اور دین توحید حنیف کے احکام کی رعایت کرنے والے کم سے کم ہوتے گئے جو الٰہ واحد کے اعتقاد ، بیت اللہ کے طواف و حج، عمرہ، عرفہ میں وقوف اور جانوروں کی قربانی ، حج و عمرہ کے تلبیہ اور اہلال وغیرہ پر مبنی تھا، ان عربوں میں صرف ایک محدود تعداد ہی بعثت محمدیہ کے زمانے تک اس دین حنیف پر باقی نہ رہ سکی، ختنہ، حج بیت اللہ ، جنابت کے غسل، بت پرستی سے اجتناب ہی وہ فرق و امتیاز کرنے والی علامات رہ گئیں جو حنفاء کو مشرکین سے الگ کرتی تھیں۔ (ایضاً 290/6)

شاہ ولی اللہ دہلوی نے رسول اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے کہ آپ ملت حنیفیہ اسماعیلیہ میں جو کجی آگئی تھی اس کو دور کرنے، اس کی تحریف کو ختم کرنے اور اس کے نور کو پھیلانے کے لیے مبعوث فرمائے گئے تھے۔فاعلم انه ﷺ بعث بالملة الحنيفية الاسماعيلية لا قامة عوجها و الزالة تحريفها و اشاعة نورها ـ ـ ـ ـ ـ (حجه الله البلاغه، 271/1-272) نور محمد اصح المابع كراچی 1302ھ معہ اردو ترجمہ مولانا حقانی، باب بيان ما كان عليه جال اهل الجاهلية فاصلحه النبی ﷺ)۔

عرب میں دین ابراھیمی کی تاریخ وآثار

یہ امر واقعی ہے کہ حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کی وفات کے مدتوں بعد تک اصل دین ابراہیمی باقی رہا بلکہ تمام آلایش و امتزاج سے پاک خالص دین کے بہ طور زندہ اور زیر عمل رہا، لہٰذا تمام ابتدائی پیروانِ حضرت اسماعیل (علیہ السلام) خالص دین ابراہیمی،حنیفیت مسلمہ، کے ماننے والے اور صحیح مسلمین ہی تھے جیسا کہ قرآن مجید ان کا نام مسلم ہی بتاتا ہے۔: " ۔هو سماكم المسلمين من قبل وفی هذا (الحج 78) شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی وضاحت سے لکھا ہے کہ بنو اسماعیل نے اپنے جد امجد حضرت اسماعیلؑ کا طریقہ پایا اور ان کی شریعت پر مدتوں قائم رہے تا آنکہ عمرو بن لحہ نے اپنی فاسد رائے سے اس میں بہت سی چیزیں دخل کردیں اور خود گمراہ ہوا اور دوسروں کو گمراہ کیا۔۔۔۔ وكان بنو اسمائيل تو ارثو منهاج ابيهم اسماعيل فكانو علی تلک الشريعة الی ان وجد عمرو بن لحی فادخل فيها اشياء براية الكاسد فضل و اضل (272/1)

مدتوں بعد جب دین ابراہیمی(حنیفیت) میں آمیزش ، بدعت اور انحراف کی کار گزاری شروع ہوئی تو بھی بہت سے لوگ اصل دین ابراہیمی پر باقی رہے اور حنیفیت پر قائم رہنے والوں میں شمار ہوئے، عرب مصادر کی تقریباً یہ متفقہ روایت ہے کہ عرب بالخصوص مکہ مکرمہ میں شرکت اور بت پرستی کی رسم و طرح ایک بدوی عرب سردار عمرو بن لحہ خزاعی نے ڈالی جو شام کے سفر کے دوران بت پرستی سے آشنا ہوا تھا، بالعموم اسی شخص کو دین ابراہیمی کو بدل ڈالنے والا کہا جاتاہے، اس کی بدعت سے قبل عرب بالعموم دین حنیفی کے پیرو تھے:

" انه كان اول من غير دين اسماعيل فنصب الاوثان ـ ـ ـ ـ ـ " (ابن هشام، 81/1 و مابعد)"

واستبدلو بدين ابراہيم و اسماعيل غيره فبعدوالاوظان وصاروا الی ما كنات عليه الامم قبلهم من الضلالات و فيهم علی ذلک بقايا من عهد ابراہيم يتمسكون بها من تعظيم البيت ولطواف الاعمرة" (ابن هشام، 82/1 شاہ ولی اللہ دہلوی، حجة الله البلاغہ، 272/1 نیز 279)

بعثت نبوی سے قریب تین سو سال قبل ہی عمرو بن لحہ کی بدعات شروع ہوئیں اس سے قبل عرب اپنے جد امجد کے اصل دین پر قائم تھے، وبكان بنو اسمائل علی منهاج ابيهم الی ان وجدفيهم عمرو بن لحی و ذلک قبل مبعث النبی ﷺ قريبا من ثلثمانة سنة ـ ـ ـ ـ ـ)۔

شرک و بت پرستی کے رواج عالم کے باوجود عرب کے مختلف قبائل میں حنفاء و احناف ہمیشہ موجود رہے، جغرافیائی لحاظ سے ان کا تعلق تمام سمتوں سے تھا، یہی وجہ ہے کہ احناف کا قبائلی تعلق مختلف علاقوں سے ملتا ہے اس کا سبب اصلی بقول مودودی (رحمۃ اللہ علیہ) "رسالت اسماعیلی " کے اثرات و

باقیات کی ان کی زندگی میں کار فرمائی تھا، وہ دین ابراہیمی سے وابستہ رہے اور تمام بدعات و انحرافات کے باوجود ان میں حنیفیت اور دین خالص کے بہت سے باقیاتِ صالحات باقی رہے، دین ابراہیمی کے ان کے مبارک بقایا ہی نے ان میں عقاید بھی کسی حد تک باقی و محفوظ رکھے اور اعمال دین اور رسول معاشرت بھی، قدیم و جدید علما نے دین ابراہیمی کے باقیات پر بہت کچھ لکھا ہے، شاہ ولی اللہ دہلوی نے بہت حکیمانہ بات لکھی ہے، کہ رسول اکرم ﷺ نے (اللہ کے حکم سے) منہاج اسماعیلؑ کے موافق عربوں کی شریعت کے اجزاء کو باقی رکھا اور ان کے شعائر کورائج رہنے دیا ، تحریف و فساد کی اصلاح فرمادی: فما كان منها موافقا لمنهاج اسماعيل (عليه السلام) او من شعائر الله ابقاه وما كانها تحريفا او فسادا۔ ۔ ۔ ابطله و سجل على ابطاله۔ ۔ (حجة الله البلالغه، 272/1)۔

1۔مکہ مکرمہ اور قریش:

بالعموم روایتی سیرت نگار مکہ مکرمہ کے چار قریشی احناف کا ذکر کرتے ہیں، ابن اسحاق کی رویات ہے کہ قریش اپنے اصنام (بتوں) میں سے کسی ایک بت کے پاس اپنی ایک عید منانے کے لیئے جمع ہوتے ، وہ اس کی تعظیم کرتے، اس کے لیئے جانور قربان کرتے اور اس کے سجدے و طواف کرتے، ہر سال کا ایک دن اس عید کے لیے مخصوص و معلوم تھا، قریش کے چار افراد نے اپنی قوم سے علیحدگی اختیار کرلی اور ایک دوسرے سے کہا: سچ بتاؤ اور ایک دوسرے کا راز محفوظ رکھو ، سب نے اتفاق کیا اور یہ تھے :

1۔ورقہ بن نوفل اسدی قریشی

2۔عبید اللہ بن جحش اسدی خزیمی، ان کی والدہ امیمہ بنت عبدالمطلب ہاشمی تھیں۔

3۔عثمان بن الحویرث اسدی قریشی

4۔زید بن عمر بن نفیل عدوی قریشی

ان سب نے بہ اتفاق حنیفیت دین ابراہیمی کو تلاش کرنے اور اسے اختیار کرنے کا عزم کیا (242/1) کچھ مدت وہ حنیفیت پر قائم و عامل رہے پھر تینوں اول الذکر نصرانی بن گئے اور مؤخر الذکر ہی صرف حنیفیت پر تا آخر قائم رہے، حضرت ورقہ بن نوفل اسدی کو بعثتِ محمدؐ کی تصدیق کا موقع ملا اور ان کو اسلام کی دولت ملی، یہ دولت عبید اللہ اسدی خزیمی کو بھی مکہ مکرمہ میں نصیب ہوئی تھی مگر حبشہ جاکر انہوں نے وہ کھودی اور بہ طور نصرانی حبشہ میں وفات پائی، عثمان بن حویرث اسدی قریشی بھی بہ بطور نصرانی شام میں مرے، صرف حضرت زید " امت مسلمہ واحدہ " اورحنیف کامل رہے

(244-243/1) سہیلی، 366-358/2 و مابعد، ابن کثیر، البدایۃ و النہایۃ، مطبعۃ السعادہ مصر، غیر مورخہ ، 243-237/2، محمد بن حبیب بغدادی، کتاب المحبر، حیدرآ باد دکن، 1942، 171-172، کتاب المنمق، حیدرآباد دکن 1964، 175-158، ابن قتیبہ، کتاب المعارف، مرتبہ ثروت عکاشہ، قاہرہ 1960، 59، ذکر ورقہ بن نوفل و زید بن عمر بن نفیل۔۔۔۔۔۔ شرح الفوائد الغياثيه حواشى الكازرونى تفسير البيضاوى صحيح بخارى بلوغ الأرب، 269/2-275 برائے حضرت ورقہ بحوالہ آلوسی، بلوغ الأرب، 247/2-253 بحوالہ استیعاب، اصابہ، ابن اسحاق، واقدی، دوائی، دیباچہ العقائد العضدیہ عیسٰی الصفوی)

بقول مولانا شبلی و مودودی (رحمۃ اللہ علیہ) صرف یہی چار افراد حنفاء و احناف نہ تھے، متعدد دوسرے بھی تھے، لیکن ان دونوں نے مکی اور قریشی افراد کا اپنی فہرست احناف میں ذکر نہیں کیا ہے۔بلکہ بدوی قبائل اور دوسرے دیار و امصار کے احناف کے اسماء گرامی بھی گنائے ہیں: زید بن بکار، نسب قریش، ابن کثیر، ابن اسحاق ، سہیلی، ابراہیم البقاعی، بذل النصح و الشفقۃ اللتعریف بحبۃ السید ورقہ)۔

مکہ مکرمہ اور قریش میں اور بھی صاحبانِ بصیرت تھے جو عرب کے رواجی دین سے بے زار اور دین ابراہیمی کے پیروکار تھے، ابن اسحاق و ابن ہشام نے جو سبب مذکورہ بالا چار افراد کے حنیف ہونے یا بننے کا بیان کیا ہے وہ بھی محل نظر معلوم ہوتا ہے، ان کی روایت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان چاروں نے اچانک عیدِ قریش کے موقعہ پر اجتماعی طور سے رواجی دین ترک کیا تھا، بت پرستی چھوڑدی تھی اور حنیفیت کی جستجو میں لگ گئے تھے، اور وہ بھی اجتماعی طور سے ان کی دین فکر کے پیچھے ان کے غور و فکر اور دوسرے اسباب و علل کا کوئی حوالہ نہیں ملتا اور جدید اہل قلم اس کا تجزیہ بھی نہیں

کرتے، اصل بات یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں مدتوں سے دین حنیف کو ماننے، دین ابراہیمی کی طرف لوٹنے اور رواجی مذہب سے دور رہنے کا رجحان پایا جاتا تھا اور بہت سے مردانِ کار نہ صرف توحید الہیٰ کے قائل تھے بلکہ وہ بہت سی شرعی قانونی روایات اور سماجی اقدار کی بھی پیروی کرتے تھے۔

ان میں ایک اہم ترین نام وجز بن غالب کا ہے جن کی کنیت ابو کبشہ تھی، وہ بتوں کی پوجا کا انکار کرتے تھے اور اس کو معیوب گردانتے تھے اور بت پرستوں پر طعن کرتے تھے، اسی بناء پر نبی کریم ﷺ کو سے مشابہ قرار دے کر مشرکینِ مکہ آپ ﷺ کو بھی " ابو کبشہ یا ابن ابی کبشہ " کہا کرتے تھے، کہ آپ ﷺ بھی بت پرستی کے خلاف تھے: " كان وجز بن غالب ينكر عبادة الاصنام و يعيبها ويطعن على اهلها و كان يكنى وبا كبشہ فشبهو الانبى ﷺ بہ" (بلاذری، انساب الاشراف، مرتبہ محمد حمید اللہ، قاہرہ 1959ء، (اول) 91/1)

یہ وجز بن غالب خزاعی تھے اور رسول اکرم ﷺ کے نانا وھب بن عبد مناف زہری کی والدہ ماجدہ ہند بنت ابی قیلہ کے والد تھے، ابوقیلہ ان کی اصل کنیت تھی، وہ مکہ مکرمہ کے باشندے بن گئے تھے اور اس کے اہم ترین اکابر و سادات میں تھے، قریش رسول اکرم ﷺ کے لیے کہا کرتے تھے کہ اب ابی کبشہ نے یہ کہا ہے: " فكانت قريش تقول للنبى ﷺ : فعل ابن ابى كبشہ كذا " (بلاذری، 91/1) محمد بن حبیب بغدادی، کتاب المحبر، مرتبہ ایلزرہ یحستن شیتیتر، حیدرآباد دکن 1942، 129-130)

بغدادی اور بلاذری نے بھی بعض اور ایسے موحدین کا ذکر کیا ہے جن کو ابو کبشہ کہا جاتا تھا۔ نبوی نانا کے علاوہ دوسرے یہ حضرات تھے:

1۔ عمر بن زید بن لبید نجاوی، عبدالمطلب کے نانا،

2۔ وھب بن عبد مناف زہری، رسول اکرم ﷺ کے نانا،

3۔ حارث / غبشان بن عمر بن لوی بن ملکان۔۔۔۔۔،

4۔ حارث بن عبد العزیٰ سعدی ہوازنی، رسول اکرم ﷺ نے حاضن (رضاعی باپ) مرتب نے وجز بن غالب بن حارث کے لیے طبقات ابن سعد 31-1/1 کا حوالہ دیا ہے۔

خاندانِ بنی عبد مناف کے بانی اور رسول اکرم ﷺ کے ایک جدِ اعلیٰ عبد مناف بن قصی جن کا اصل نام مغیرہ تھا، لوگوں کو اللہ کے تقوی اور صلہ رحمی کا وعظ دیا کرتے تھے اور وصیت کرتے تھے: " ان المغیرہ بن قصی اوصی قریشا بتقوی اللہ و صلۃ الرحم" یہ ایک کتابِ سنگ میں لکھی ہوئی یا نقش کی ہوئی وصیت بیان کی جاتی ہے اگرچہ اس کو ضعیف روایت مانا گیا ہے۔ (بلاذری، 52/1) البتہ بعض اہل قلم نے پوری صحت و التزام کے ساتھ بیان کیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے دادا جناب عبدالمطلب بن ہاشم توحید الہیٰ کے قائل تھے اور بہت سے عقاید و اعمالِ دین ابراہیمی پر عمل پیرا بھی تھے، ان روایات کا روایتی و درایتی پایہ کمزور ہے ، ایک تاریخ داں کا واضح بیان ہے کہ انہوں نے بتوں کی عبادت ترک کردی تھی او ر اللہ عزو جل کی توحید کے قائل تھے: " ورض عبادة الاصنام و وحد الله عزوجل۔ ۔ ۔ فكانت قريش تقل : عبدالمطلب ابراہيم الثانى۔ ۔ ۔ ووفى بالنذر و سن سننا نزل القرآن باكثرها و جاءت السنة من رسول الله ﷺ بها۔ ۔ ۔ ۔ ۔" (یعقوبی، تاریخ بیرت، 1960، 10/2 مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو خاکسار راقیم(ڈاکٹر یسین مظہر صدیقی) کی کتاب " عبدالمطلب ہاشمی ۔۔۔رسول اکرم ﷺ کے دادا " غیر مطبوعہ)۔

کعب بن لوی بن غالب رسول اکریم ﷺ کے اجداِ اعلیٰ میں صاحب، بصیرت و شوکت سمجھے جاتے تھے، زبیر بن بکار کے مطابق وہ ہر جمعہ کو قریش کو جمع کرتے اور ان کو اطاعت ، فہم، تعلم، اور تفکر کی دعوت دیتے کہ وہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور رات دن کی گردش پر غور کریں، اولین و آخرین کے احوال و اعتبار کو سمجھیں ، وہ ان کو صلہ رحمی، اسلام کی اشاعت ، عہد کی پاس داری، رشتہ داری، کی رعایت اور فقیروں اور یتیموں کے ساتھ حسن سلوک پر ابھارتے ، موت اور اس کی ہولنا کیوں سے ڈراتے، یومِ موعود اور اس کے احوال یاد دلاتے اور نبی آخر الزماں کی بعثت کی بشارت دیتے تھے، ان کی کرامات و حالات و خیالات کی بناء پر یہ سمجھا جاتا کہ وہ دین ابراہیمی سے تمسک اور حنیفیت پر گامزنی کے باعث ان میں آئے تھے، اسی بناء پر بہت سے علماء کا خیال ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے تمام صلبی اجداد (جمیع اصول النبی علیہ الصلاۃ و السلام) اپنے اعتقاد کے لحاظ سے موحدین اور بعثت بعد الموت اور حساب اور دوسرے احکام حنیفی پر ایمان رکھنے والے تھے جیسا کہ ماوردی نے اعلام النبوہ میں بیان و واضح کیا ہے، آلوسی نے اسی ضمن میں

دوسرے اجداد نبوی جیسے عبدالمطلب، ہاشم عبدمناف ، قصی ، عبداللہ بن عبدالمطلب کا ذکر خیر بھی کیا ہے اگرچہ حوا نبوی سے کیا ہے، (بلاغ الارب، 282-281/2) خاتمہ بحث احناف در بلوغ الارب)۔

2۔ یثرب / مدینہ :

دور جاہلیت میں توحید الہیٰ اور دینِ ابراہیمی کا دوسرا بڑا مرکز یثرب تھا جو مکہ سے پانچ سو کلو میٹر شمال میں تھا، اور اوس و خزرج کے دو جنوبی عرب کے قبیلے وہاں آباد تھے اور وہ بھی رواجی دین عرب کے ساتھ دین ابراہیمی سے تعلق رکھتے تھے، ان کے علاوہ یہودیوں کے متعدد قبیلے اور شاخیں بھی یثرت میں سکونت پذیر تھیں اور وہ بھی بہرحال دین ابراہیمی کی شاخیں تھیں، یہ دوسری بات ہے کہ انہوں نے اصل دین میں انحرافات پیدا کرکے اس کی ا صل صورت بگاڑ کر اسے یہودیت بنا دی تھی، تاہم وہ توحید الہی کے قائل اور اس پر عامل تھے، سب نہ سہی تو کافی تعداد میں اور اس کی تصدیق قرآن مجید سے ہوتی ہے، پھر وہ بہرحال بت پرستی اور شرک کی دوسری عرب رواجی خرافات سے مبرا تھے اور حضرت ابراہیم سے اپنا ربط جوڑتے تھے، اوس و خزرج کے قبیلے کچھ تو دین ابراہیمی کے باقیاتِ صالحات کی بناء پر اور کچھ یہودی علماء و احبار کے صحیح افکار کے سبب حنیفیت سے واقف بھی تھے اور ان میں سے بعض اس کے قائل و عامل بھی۔

یثرب کے ایک اہم شخص سُوید بن صامت اوسی تھے، وہ اپنی عقل و فہم ، صلاحیت و لیاقت اور پاکیزگی کی بناء پر " الکامل " کئ لقب سے معروف تھے، ان کی والدہ رسول اکرم ﷺ کے دادا جناب عبد المطلب ہاشمی کے خالہ زاد بھائی تھے۔ان کو امثالِ لقمان کا ایک صحیفہ یا مجلّہ مل گیا تھا اور اس بناء پر ان کو " حنیف " سمجھا جاتا تھا، رسول اکرم ﷺ سے ان کی ملاقات بھی ہوئی تھی اور وہ اسلام سے متاثر بھی ہوئے تھے۔(ابن ہشام، 36-34/2) سہیلی ، الروض الانف، مترجمہ عبدالرحمٰن الوکیل، قاہری،1967، 43/4، 65-67، شبلی، 261-260/1، بلاذری، 238/1):" وکانو یرون انہ مسلم")

"صِرمہ بن انس، یہ بنی عدی بن نجار میں سے تھے، جاہلیت کے زمانے میں درویشی اختیار کرلی تھی، بت پرستی چھوڑ دی تھی، غسل جنابت کرتے تھے اور حائضہ سے پرہیز کرتے تھے، شراب اور ہر نشہ آور چیز کو ناپسند کرتے تھے، پہلے عیسائی ہونے کا ارادہ کیا پھر رک گئے اور ایک مسجد بنا لی جس میں کسی جنبی یا حائضہ کو نہیں آنے دیتے تھے، کہتے تھے کہ میں رب ابراہیم کی عبادت کرتا ہوں اور دین ابراہیمی کا پیرو ہوں، ان کا ایک شعر یہ ہے:

الحمد للہ ربی لا شریک لہ من لم یقلھا فنفسہ ظلما

رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو یہ بہت بوڑھے ہوچکے تھے، انہوں نے حاضر ہوکر اسلام قبول کیا"، (مودودی، سیرت، 71/2 بحوالہ الاستیعاب، ج 323/1، الاصابہ، 179/2، ابن ہشام، 156/2)

ابن قتیبہ نے ابو قیس صرمہ بن ابی نس نجاری کے بارے میں تقریباً یہی لکھا ہے: " وکان ترھب ولبس المسوح و فارق الاوثان وھم بالنصرانیہ ثم امسک عنھا و دخل بیتا فاتخذہ مسجد الا یدخل علیہ ثامث و لا جنب و قال: اعبد رب ابراہیم فلما قدم رسول اللہ ﷺ المدینۃ اسلم و حسن اسلامہ " نعتِ نبوی میں ان کا ایک طویل قصیدہ بھی ہے، (ابنِ قتیبہ، کتاب المعارف 61، ابن ہشام، 130/2) بلوغ الارب، 266/2)۔

ابن سعد نے یثرب کے دو اور موحدین کا ذکر کیاے، وہ ہیں" اسعد بن زرارہ نجاری خزرجی اور ابو الہیثم بن التیہان اور دونوں یثرب میں توحید کی بات کیا کرتے تھے: " وکان اسعد بن زرارۃ و ابو الھیثم بن التیہان یتکلمان بالتوحید بیثرت" (الطبقات الکبری، دار صادر بیروت 1960، 218/1)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ذکوان بن عبد قیس نے رسول اکرم ﷺ کا پیغام سن کر حضرت زید بن زرارہ سے کہا تھا کہ یہ تو تمہارا دین معلوم ہوتا ہے، حضرت ذکوان بن عبد قیس بھی انہیں موحدین اور احناف میں شمار کیئے جانے کے لائق ہیں، انہوں نے رسول اکرم ﷺ کے پیغام کے بارے میں سنا تو مدینہ ہجرت کرکے مکہ پہنچے اور اسلام قبول کرکے وہیں بس گئے اور پھر آپ ﷺ کے ساتھ ہی مکہ سے مدینہ کو گئے تھے اسی لیے ان کو " مہاجری انصاری " دونوں کہا جاتا تھا، " (بلاذری 245/1) بلاذری نے ان کے لیے " فھو من مھاجری الانصار " کا فقرہ استعال کیا ہے کہ ان کے علاوہ بعض اور ایسے مدنی تھے جو مکہ میں بس گئے تھے اور یہ ایک اور قرینہ ان کے حنیف ہونے کا ہے کہ اسی کےزیر اثر و ہ بعثت نبوی ﷺ کی خبر سن کر مکہ ہجرت کرگئے تھے۔

3۔ قبائل عرب :

مکہ و یثرب کے علاوہ دوسرے شہروں کے حوالے سے احناف کی تاریخ بیان کرنا مشکل ہے، اس کی متعدد وجوہ ہیں، ان میں سے سب سے اہم یہ ہے کہ ان کی قبائلی نسبت زیادہ معروف بھی ہے اور وسیع بھی، ان کی مکانی نسبت اتنی اہم نہیں کہ وہ کسی خاص علاقہ سے وابستہ ہونے کے باوجود اس سے زیادہ متعلق نہ تھے، ان میں سے متعدد کا تعلق بیک زمان متعدد علاقوں سے بھی تھا یا مختلف ادوارِ حیات میں وہ مختلف دیار سے وابستہ رہے، مزید یہ کہ علاقائی و مکانی نسبت کی بجائے ان کے بارے میں معلومات زیادہ تر قبائلی تعلق کے حوالے سے ملتی ہیں، لہٰذا دوسرے موحدین اور حنفاء کا ذکر ان کی قبائلی نسبت سے کرنا زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔

ثقیف / ہوازن:

عہد جاہلی کے مشہور شاعر امیہ بن ابی الصلت ربیعہ بن وہب ثقفی کو احناف میں شمار کیا گیا ہے، ہمارے بعض راویان خوش بیان کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ احناف کے اوصاف طہارت و صفاتِ عالیہ کی بنا کر ان کو نبی کے درجہ پر فائز کردیتے ہیں۔ چناچہ بعض روایات نے امیہ ثقفی شاعر کو بھی نبی بنا دیا ہے جیسے بعض دوسروں کو بنایا ہے، اس باب میں یہ واضح رہنا ضروری ہے کہ حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کے بعد حضرت محمد بن عبداللہ ہاشمی ﷺ تک کوئی رسول و نبی سر زمینِ عرب میں مبعوث نہیں ہوا۔ یہ اسلامی عقیدہ بھی ہے اور تمام قدیم و جدید ماہرین کا متفق فیصلہ بھی۔

(ابن کثیر، البدایہ و النہایہ ، 212/2:-------۔ وقد قال " غیر واحد من العلماء ان اللہ تعالی لم یبعث بعد اسماعیل نبیا فی العرب الا محمدا ﷺ) غالبا ان روایات کا مقصود بھی یہی ہے کہ وہ اوصافِ نبوی کے حاملینِ عالی مقام تھے کیوں کہ وہ (روایات) بھی انکی نبوت کی بعد میں تردید کرتی نظر آتی ہیں یا ان کے بارے میں وضاحتی بیانات دیتی ہیں، امیہ بن ابی الصلت ثقفی کے باب میں بھی نظر یہی آتا ہے۔ (ابن کثیر، البدایہ وا النہایۃ، 12/2:-------۔ والظاہر ان ہؤلاء کانو قوما صالحین یدعون الی الخیر و اللہ اعلم)

حافظ ابن عساکر کے مطابق وہ دمشق گئے تھے اور وہ مستقیم صاحبِ جادہ حق تھے، اول امر میں ایمان پر تھے بعد میں گمراہ ہوئے ، (ابن کثیر، البدایۃ و النہایۃ، 221-220/2) ابن قتیبہ، کتاب المعارف، 60، بلوغ الارب، 258-253/2 بحوالہ اصمعی، صحیح مسلم، اصابہ، شرح دیوان امیہ از محمد بن حبیب، الاغفانی ابن قتیبہ، طبقات الشعراء، دیوان امیہ وغیرہ)، شاہ ولی اللہ دہلوی حجۃ اللہ البالغۃ، 276-275/1: ان النبی ﷺ صدق امیۃ بن الصلت فی بیتین من شعرہ)

حافظ طبرانی کی سند پر ایک روایت ابن کثیر نے نقل کی ہے جو امیہ بن ابی الصلت ثقفی کے دین و عقیدہ کو بتاتی ہے، اس کا لبِ لباب یہ ہے کہ حضرت ابوسفیان بن حرب اموی اور امیہ ابن ابی الصلت ثقفی ایک بار شام تجارت کے لیے گئے، وہاں نصاریٰ کے ایک گاؤں کے ایک عظیم عالم سے ملاقات کی اور امیہ ثقفی نے نہ صرف آخرت اور مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے اور جنت و جہنم کے دخول کے بارے میں اپنے عقیدہ کا اظہار کیا بلکہ جناب ابو سفیان اموی کو ان کا قایل کرنے کی کوشش کی: " بلی! و اللہ یا ابا سفیان ! لتبعثن ثم لتحاسبن ولید خلن فریق الجنۃ و فریق النار (222/2) اسی سفر کے دوران رفقائے تجارت نے عتبہ بن ربیعہ کی صفات عالیہ کے علاوہ اہل بیت اللہ میں سے ایک نبی مکرم کے مبعوث ہونے پر بھی مباحثہ کیا، ان کی صفات بیان کیں، امیہ بن ابی الصلت ثقفی نے عیسائی عالموں کے بیان کردہ صفات نبوی کا مستحق اپنی ذات کو سمجھا تھا۔ محمد بن عبداللہ ہاشمی ﷺ کی نبوت و رسالت کی خبریں سن کر ان کی ثقفی عصبیت جاگ اُٹھی اور انہوں نے رسالت محمد تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور اس کی بنا پر وہ ذلت و توہین کا ہدف بھی بنے، (223/2) بعض روایات کے مطابق انہوں نے بالآخر رسول اکرم ﷺ سے ملاقات کی اور سورۃ یٰس کی تلاوت نبوی سن کر نبوت کی تصدیق کی ، اور غزوہ بدر کے بعد وہ ایمان کے لیے تیار بھی ہوئے پھر غیرت قومی کا شکار ہو کر بلا ایمان مرے (226/2 و ما بعد)۔

امیہ بن ابی الصلت ثقفی بنیادی طور سے طائف کے باشندے تھے اور قریش مکہ سے قریبی ربط رکھتے تھے، ان کی ماں اموی / عبشمی سردار مکہ عبدالشمس بن عبد مناف کی دختر رقیہ تھیں، اس بنا پر وہ بنو عبد شمس / بنو امیہ کے قریبی عزیز تھے، حضرت ابوسفیان بن حرب بن امیہ بن عبد شمس کا ان سے رشتہ بہت قریبی تھا (221/2) ان کے کلام کی صداقت کی تائید رسول اکرم ﷺ کی ایک حدیث شریف سے بھی ہوتی ہے اور ان کی حنیفیت کی

بھی، حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ تعالی عنہ) کی روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: بلا شبہ سب سے سچا کلمہ جو کسی شاعر نے کہا وہ کلمہ لبید ہے:" الا کل شئ مال خلا اللہ باطل " اور امیہ بن ابی الصلت تو مسلمان ہونے کے قریب تھے: " وکان امیہ بن ابی الصلت ان یسلم " ان کے بارے میں یہ حدیث کہ شعر ان کا مومن تھا اور دل ان کا کافر: " آمن شعرہ و کفر قلبہ " حافظ ابن کثیر کے نزدیک غیر معروف ہے، (شاہ ولی اللہ دہلوی، حجۃ اللہ البالغۃ، 227/1: شاہ صاحب نے منہاج اسماعیل کے اثرات کو قبول کیا ہے، ابن کثیر ، البدایہ و النہایہ، 228/2 ومابعد)۔

بنو عبس بن بغیض:

بنو عبد کا قریبی رشتہ غطفان اور اس کی ذیلی شاخ سے تھا اور وہ ایک عظیم و طاقت ور قبیلہ تھا، اسے غطفان میں بھی بہت اہم مقام حاصل تھا، ان کی طاقت سیاسی، سماجی، فوجی اور عددی تھی، وہ مکہ و مدینہ کے مابین بستے تھے اور ان کے ایک اہم صحابی حضرت نعیم ابن مسعود اشجعی تھے جو بنو عبس بن بغیض کے بھی عامل صدقات مقرر کیے گئے تھے۔ان کے علاوہ متعدد دوسرے اکابر قبیلہ تھے، (عہد نبوی میں تنظیم ریاست و حکومت ، باب دوم، 149-148 وما بعد اور ان کے حواشی)

اس کے ایک حنیف و موحد کا نام خالد بن سنان بن غیث تھا، ان کے بارے میں بھی روایت آتی ہے کہ وہ ایک نبی تھے۔(ابن کثیر، البدایہ و النہایہ، 211/2: الذی کان فی زمن الفترۃ و قد زعم بعضھم انہ کان نبیا واللہ اعلم: بحوالہ طبرانی، بزار) جن کو ان کی قوم نے ضایع کردیا، وہ دبادتِ اوثان ترک کرچکے تھے، دین ابراہیمی کے متلاشی تھے اور قیامت کا عقیدہ رکھتے تھے، ان کی دختر نیک اختر رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپ ﷺ کو سورہ اخلاص تلاوت کرتے ہوئے سنا۔ قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ (١) ۔ ۔ ۔ ۔۔ تو انہوں نے بے ساختہ کہا کہ میرے والد بھی یہی کیا کرتے تھے کہ اللہ ایک ہے، (ابن قتیبہ، کتاب المعارف، 62، ابن کثیر، البدایۃ و النہایہ، 211/2-212، بلوغ الارب، 278/2-280: کان مقرابتوحید الربوبیۃ والا لوھیۃ ناھجا منھم الملۃ الحنیفیہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بحوالہ ابوعبیدہ معمر بن المثنی، کتاب الجماجم، حاکم مستدرک ، الدمیری حیاۃ الحیوان، القزوینی، العکبری، شرح المقامات، ابن حجر ، الاصابہ وغیرہ)

حافظ ابن کثیر نے ان کے نبی ہونے کی روایات پر تنقید کی ہے اور کہا ہے کہ وہ ایک مرد نیک تھے جن کو احوال و کرامات حاصل تھے اگرچہ ہو زمانہ فترۃ میں تھے : " والاشبہ انہ کان رجلا صالحا لہ احوال و کرامات فانہ ان کان فی زمان الفترۃ .

عبد القیس:

عرب کے مشرقی سواحل پر ایرانی سرحدوں کے قریب عبدالقیس کا طاقت ور قبیلہ بڑی آبادی رکھتا تھا، وہ موحدین و اہل ملت کی جماعت بھی رکھتا تھا اور متعدد دوسرے مردانِ حق کار اور متلاشیانِ حق کے وجود سے بھی مشرف تھا، (عہد نبوی میں تنظیم ریاست و حکومت ، باب دوم، 190-192 و مابعد اور اس کے حواشی)

جاہلی دور میں رئاب بن البراء عبد القیسی کو حنیف یا متلاشی حق مانا گیا ہے بعد میں وہ نصرانی بن گئے تھے، ان کو اپنے دور کے بہترین افراد میں گردانا جاتا تھا. قبیلہ / خاندان " شن " سے متعلق ہونے کی بنا پر وہ " رئاب الشنی " کہلاتے تھے (ابن قتیبہ 58)، آلوسی نے ان کا نام ارباب بن رئاب شنی عبدالقیسی لکھا ہے اور ماوردی ی کتاب اعلام النبوۃ حوالہ سے ایک نشنی کے بت پرستی سے تائب ہونے کا ذکر کیا ہے کہ وہ بعد میں مکہ پہنچ کر مسلمان ہوگئے، رسول اکرم ﷺ سے ان کی ملاقات اور ندائے ہاتف کا حوالہ بھی ہے (بلوغ الارب، 258/2-259، بحوالہ ابن قتیبہ، المعارف، و ماوردی)۔

حمیر:

جنوبی عرب کی جو زرخیز ساحلی پٹی یمن سے ہجر تک جاتی ہے وہ عظیم و کبیر قبیلہ حمیر کی سر زمین تھی، (عہد نبوی میں تنظیم ریاست و حکومت ، باب دوم، 177 ومابعد اور اس کے حواشی) اس کے ایک عظیم فرد اور بطل جلیل اسعد ابو کرب الحمیری تھے، اگرچہ وہ جنوبی عرب کے فرد تھے مگر بیت اللہ سے ان کو خاص تعلق تھا اور روایت کے مطابق وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے خانہ کعبہ پر چمڑے اور کپڑے کی چادریں (انطاع و البرود) کا غلاف

چڑھایا تھا، یہ اشارہ ان کے صاحبِ ایمان و عقیدہ ہونے کی طرف ہے۔ان کا زمانہ ابن قتیبہ کے مطابق رسول اکرم ﷺ سے سات سو سال قبل کا تھا، (ابن قتیبہ کتاب المعارف ، 60، آلوسی، بلوغ الارب، 260/2۔بحوالہ ابن قتیبہ، کتاب المعارف)۔

قبایل یمن و جنوبی عرب:

سیف بن ذی یزن والی / شاہِ یمن اور عبد المطلب ہاشمی کی ملاقات کا ذکر تقریباً تمام اہل سیر نے کیا ہے اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ نبی آخر الزماں کی بعثت کے علاوہ الہ واحد کے قایل تھے ، ان کے علاوہ " یمن میں چوتھی، پانچویں صدی عیسوی کے جو کتبات آثارِ قدیمہ کی جدید تحقیقات کے سلسلے میں برآمد ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں وہاں ایک توحیدی مذہب موجود تھا جس کے پیرو الرحمان اور رب السماء و الارض ہی کو الہ واحد تسلیم کرتے تھے۔378ء کا ایک کتبہ ایک عبادت گاہ کے کھنڈر سے ملا ہے جس میں لکھا گیا ہے کہ یہ معبد " الہ دوسموی " یعنی الہ الاسماء یا رب السماء کی عبادت کے لیئے بنایا گیا ہے۔ 465ء کے ایک کتبے میں " بنصر ورداً اٰھن بعل سمین و ارضین و ابنصرین و بعون الا الہ رب السماء والارض " کے الفاظ لکھے ہیں جو عقیدہ توحید پر صریح دلالت کرتے ہیں۔اسی دور کا ایک اور کتبہ ایک قبر پر ملا ہے جس میں " بخیل رحمنن " (یعنی استعین بجول الرحمن) کے الفاظ لکھے ہوئے ہیں۔اسی طرح شمال میں دریائے فرات اور قنسرین کے درمیان زبد کے مقام پر 512ء کا ایک کتبہ ملا ہے جس میں " بسم الا الہ لا عزالا لہ لا شکر الا لہ " کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ یہ ساری باتیں بتاتی ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے انبیائے سابقین کی تعلیمات کے آثار عرب سے بالکل مٹ نہیں گئے تھے اور کم از کم اتنی بات یاد دلانے کے لیے بہت سے ذرائع موجود تھے کہ تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے، (مودودی، تفہیم القرآن، 37/4 بلاحوالہ ، بلوغ الارب، مالہ ہذا کی بحث پر عقاید و اعمال احناف)۔

قبیلہ ایاد / بکر بن وائل ۔ عبد القیس:

غالباً عہد جاہلیت کے سب سے بڑے قبایلی حنیف قُس ابن ساعدہ ایادی تھے، ان کا طویل ذکرِ خیر ملتا ہے، ابن قتیبہ نے ان کو آیات اللہ پر ایمان رکھنے والا عرب کا حکم قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ان کو بعثت سے قبل عکاظ میں ایک سرخ اونٹ پر خطبہ دیتے دیکھا تھا، حضرت ابوبکر (رضی اللہ تعالی عنہ) ان کے قصے بیان کرتے اور اشعار سناتے تھے (ابن کثیر، البدایہ و النہایہ، 234/2 کے مطابق حضرت ابوبکر (رضی اللہ تعالی عنہ) نے فرمائشِ نبوی پر ان کے اشعار سنائے تھے جو عکاظ میں خود ان سے سنے تھے) " (کان مقنا بآیات اللہ)، وکان حکم العرب و ذکر رسول اللہ ﷺ انہ راہ یخطب بعکاظ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔(ابن قتیبہ، 61) (نیز ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، دار صادر بیرو، 1960ء، 315/1 ذکر قس بن ساعدہ: وفد بکر بن وائل، بلوغ الارب، 244/2-246)

حافظ ابن کثیر کے مطابق رسول اکرم ﷺ نے قس بن ساعدہ الایادی سے اپنی ملاقات کا ذکر خیر اس وقت فرمایا تھا جب قوم ایاد کا وفد آپ ﷺ کی خدمت میں مدینہ منورہ حاضر ہوا تھا، آپ ﷺ نے ان کے بارے میں ایک شخص سے پوچھا تھا اور ان کی وفات کی خبر سن کر ارشاد فرمایا تھا اور ان کے کلامِ معجز کا حوالہ دیا تھا، یہ حافظ ابو بکر محمد بن جعفر خرائطی کی کتاب " ہواتف الجان " کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

دوسری روایت اسی مضمون کی امام طبرانی کی کتاب " المعجم الکبیر " کے حوالے سے نقل کی ہے جو زیادہ بہتر ہے: رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں قبیلہ عبد القیس کا وفد آیا تو آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ قس بن ساعدہ ایادی کو کون جانتا ہے؟ سب نے کہا کہ وہ جانتے تھے اور ان کی وفات کی خبر سن کر آپ ﷺ نے ان کے خطبہ کے الفاظ نقل فرمائے جو آپ ﷺ کو یاد ہوگئے تھے، ان میں دین کے لحاظ سے ایک جملہ یہ ہے کہ اللہ کا ایک دین ہے جو تمہارے دین سے زیادہ پسندیدہ ہے":۔۔۔۔۔۔ ان للہ دینا ھو احب الیہ من دینکم الذی انتم علیہ " (231/2) ارکان وفد سے آپ ﷺ نے ان کے اشعار بھی سنے تھے جو اس خبر میں نقل کیے گئے ہیں، حافظ ابن کثیر نے دوسرے کئی مصادر سے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے جیسے بیہقی کی " دلائل النبوۃ " ، ابن درستویہ کی " اخبار قس "، ابو نعیم اور ابن اسحاق ، امام ذہبی وغیرہ)۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت جارود بن المعلی العبدی کے وفد میں یہ مکالمہ نبوی ہوا تھا، حضرت جارود نے بتایا تھا کہ وہ اسباطِ عرب میں سے ایک سبط تھے، چھ سو سال کی طویل عمر پائی، فقیری و درویشی میں بسر کی۔۔۔۔۔۔وہ اولین عرب تھے جو توحید الہی کے قائل تھے، عبادت الہی کرتے تھے، آخرت و حساب پر ایمان رکھتے تھے، کفر سے بے زار تھے، حنیفیت کی طرف مائل تھے،"۔۔۔۔۔۔ ۔ وھو اول رجل تالہ من العرب و وحدہ و اقرو

تعبدو و ایقن بالبعث و الحساب۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وجنب الکفر و شوق الی الحنیفیہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔۔" حضرت جارود عبدی کی تقریر کافی طویل ہے اور عربی ادب کا ایک شاہکار۔۔اس پر اسلامی اقدار و تعبیرات کا رنگ پایا جاتا ہے۔

(ابن کثیر، البدایہ النہایہ، 230/2-237 بالخصوص حنیفیت کے لیے 233، مولانا شبلیؒ، 126/1 ومابعد، حجۃ اللہ البالغہ، 277/1)۔

بکر بن وائل کے ہی ایک عظیم جاہلی شاعر اعشیٰ بن قیس بن ثعلبہ کا ذکر ابن ہشام نے کیا ہے ، ان کی روایت تو یہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لانے کے ارادے سے وطن سے نکلے تھے اور اس ضمن میں ایک مدحیہ قصیدہ بھی کہا تھا، ابن ہشام نے اسے نقل کیا ہے، روایت کے بہ موجب جب وہ مکہ مکرمہ پہنچے تو قریش نے ان کو ورغلا دیا اور وہ یہ کہ کر لوٹ گئے کہ اگلے سال اسلام قبول کریں گے مگر موت نے مہلت نہ دی اور وہ اسی سال جاں بحق ہو گئے، ان کے مدحیہ قصیدہ میں کچھ اشعار بتوں کی پرستش سے ان کی بے زاری ، اللہ کی عبادت گذاری اور موت کی جاں گساری کا ذکر کرتے ہیں:

ولا النصب المنصوب لا تنسکنہ ولا تعبد الاوثان واللہ فاعبدا

(ابن ہشام، 411/1-416 بالخصوص 414 برائے شعر)۔

قبیلہ / بطن ایاد کے ایک اور حنیف حضرت کیع بن سلمہ بن زہیر ایادی تھے جن کا ذکر سید مودودیؒ نے کیا ہے تفہیم القرآن، 37/4، آلوسی، بلوغ الارب، 260/2-261 بحوالہ ابن الکلبی)

آلوسی کے مطابق ابن الکلبی نے بیان کیا ہے کہ وکیع بن سلمہ جرہم کے بعد بیت اللہ کے متولی بنے تھے اور زیریں مکہ میں ایک بنیاد (صوحا) انہوں نے بنایا تھا اور اس میں ایک " اتہ " بنائی جس کو حزورہ کہا جاتا تھا، اسی میں وہ چڑھ کر اللہ تعالی سے مناجات کرتے تھے اور عمدہ باتیں کرتے تھے، علمائے عرب کا خیال ہے کہ وہ صدیقین میں سے ایک صدیق تھے، ان کے کلام کے چند جملے بھی نقل کیے ہیں، اور وصیت بھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حنیفیت کے قائل تھے ان کی وفات ہوئی تو زبردست نوحہ و ماتم کیا گیا اور اس کے بارے میں ہم قبیلہ شاعر بشیر بن حجیر ایادی نے اشعار کہے جن میں سے دو میں توحید الہی اور تولیت کعبہ کا ذکر موجود ہے:

ونحن ایاۃ عباد الا الہ ورھط منا جیہ فی سلم

و نحن ولاۃ الحجاب العتیق (زمان النخاع) علی جرھم

ان اشعار سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بطن ایاد کے صرف یہ دو بزرگ ہی حنفاء میں شامل نہیں تھے بلکہ شاعر بشیر ایادی بھی شامل تھے اور ان کی تصدیق کے مطابق پوری " قومِ ایاد " عبادت اللہ کی قایل تھی۔کہ وہ " عباد اللہ " تھے، سب نہ بھی رہے ہوں تو کم از کم معتدبہ تعداد تو حنیف ہی معلوم ہوتی ہے۔

بنوعامر بن صعصہ:

ایک بڑے قبیلہ ہوازن کا عظیم ترین بطن بنو عامر بن صعصہ تھا جو مکہ مکرمہ اور طایف سے مربوط رہا تھا، وہ اپنی عددی طاقت اور عظمتِ افراد کے سبب خود ایک عظیمی قبیلہ بن گیا تھا، اس کو قریش کے بعد بڑے قبایل میں سمجھا جاتا تھا، وہ مختلف علاقوں میں پھیلا ہوا تھا لیکن اس کی بیشتر شاخیں مکہ، طائف اور مدینہ کے قرب و جوار میں آباد و سکونت پذیر تھی، (عہد نبوی میں تنظیم ریاست و حکومت، باب دوم، 151، 154 وما بعد بالخصوص اس کے حواشی)

اس قبیلہ کے ایک عظیم شاعر النابغہ الجعدی تھے۔جاہلیت کے زمانے میں دین ابراہیمی اور حنیفیت کا ذکر کیا کرتے تھے ، روزے رکھتے تھے اور استغفار کرتے تھے، ان کے زمانہ جاہلیت کے کلام میں توحید اور حیات بعد موت اور جزا و سزا اور جنت و دوزخ کا ذکر ملتا ہے، بعد میں انہوں نے اسلام قبول کیا" ، (مودودی، سیرت، 71/2 بحوالہ الاستیعاب، 310/2)

اسد الغابہ میں بھی ان کے توحیدی اشعار ، دین ابراہیمی اور حنیفیت اور روزہ و استغفار کا ذکر پایا جاتا ہے، ابن قتیبہ نے بھی ذکر کیا ہے، النابغہ ان کی شعری و بلاغی صلاحیت کے سبب ان کا لقب تھا، ان کا اصل نام صحیح ترین قول کے مطابق قیس بن عبداللہ بن وحوح بن عدس بن ربیعہ بن جعدہ تھا،

وہ نابغہ ذبیانی سے زیادہ معمر تھے کیوں کہ نابغہ ذبیانی شاہِ حیرہ نعمان بن منذر کے ندیم تھے اور نابغہ جعدی اس کے پیش رو منذر بن ححرق کے ندیم تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کو ایک سو اسی سال کی عمر عطاء ہوئی تھی یا زیادہ، وہ حضرت عبداللہ بن زبیر کے زمانہ خلافت یا اس کے بعد تک حیات رہے، انہوں نے نعتیہ قصاید بھی کہے تھے، (بلوغ الارب 137/2-138) ابن اثیر، اسد الغابہ، 2/5-4: " وکان یذکر فیہ الجاھلیۃ دین ابراھیم و الحنیفیۃ ویصوم و یستغفر)

حضرت لبید بن ربیعہ عامری بنو عامر بن صعصعہ کے دوسرے بڑے شاعر اور حنیف تھے اگرچہ ان کا ذکر خیز احناف جاہلیت میں بالعموم نہیں کیا جاتا، ان کا تعلق ایک دوسری شاخ قبیلہ بنو کلاب بن ربیعہ بن عامر بن صعصبہ سے تھا، امیہ بن ابی الصلت ثقفی کے ذکر کے ضمن میں جن حضرت لبید اور ان کے صادق کلمہ شاعر کا حوالہ آیا ہے وہ یہی حضرت لبید ہیں اور وہ بعد میں مسلمان بھی ہوگئے تھے، ان کے اشعار میں الہ واحد، اللہ عزو جل اور توحید کے علاوہ آخرت و بعث بعد الموت اور نبوت و رسالت وغیرہ کا ذکر ملتا ہے، قریش اور اکابر مکہ سے ان کے قریبی روابط تھے اور انہیں کی ایک مجلس میں انہوں نے اپنے مذکورہ حمدیہ اشعار سنائے تھے، یہ اشعار اور دوسرے حنیفی اشعار عہد نبوی کے ابتدائی مکی دور میں مقبول و رائج بھی تھے۔

(ابن ہشام، 392/1، ومابعد ، 157/2، ،وغیرہ، سہیلی، 349/3-352 وما بعد در مجلدات دیگر بخاری، الجامع الصحیح، بلوغ الارب، 130/3-133 بحوالہ ابن قتیبہ، الشعر و الشعراء ابن عبد البر، الاستیعاب،، ابو حاتم السجستانی، کتاب المعمرین)۔

بنو سُلَیم:

مکہ اور یثرب کے درمیانی علاقہ بنو سلیم کا خاندان بطن آباد تھا۔ یہ قیس عیلان قبیلہ کا عظیم ترین جزو تھا۔ ان کے مکہ اور یثرب دونوں سے قریبی تعلقات تھے۔ بنو سلیم کی ایک شاخ تو بنو ہاشم کی حلیف و معاون بھی رہی تھی۔ وہ اپنی عددی قوت، فوجی طاقت بالخصوص شہ سواروں کے لیے ممتاز تھے اور ان میں مردان کار کی کمی نہیں تھی۔ ان میں سے بعض کے ہاں حنیفیت کا رجحان پایا جاتا تھا۔ وہ اپنی عرب موحدانہ روایات کے لیے معروف تھے اور دوسری عرب اقدار کے لیے بھی۔ (عہدِ نبویؐ میں تنظیم ریاست و حکومت، باب دوم، 140-143 اور اس کے حواشی)

حضرت عمرو بن عبسہ سُلمی مشہور صحابی ہیں ، اسلام لانے سے قبل ہی وہ بتوں کی پرستش سے بے زار ہوگئے تھے۔ امام احمد نے اُن کا اپنا قول نقل کیا ہے کہ ''میں جاہلیت کے زمانے میں لوگوں کو گمراہی پر سمجھتا تھا اور بتوں کے متعلق میرا خیال تھا کہ یہ کچھ نہیں ہیں۔'' اُن کا ایک اور قول یہ نقل کیا گیا ہے کہ ''میرے دل میں یہ بات ڈال دی گئی تھی کہ بتوں کی پرستش باطل ہے۔ ایک شخص نے میری یہ باتیں سنیں تو کہا کہ مکہ میں ایک شخص ہے جو ایسی ہی باتیں کہتا ہے۔ چنانچہ میں مکہ آیا، رسول اللہ صلّی اللہُ علیہِ وسلّم سے مل کر آپؐ کی تعلیمات دریافت کیں اور آپؐ کی رسالت پر ایمان لے آیا۔'' (مودودی، سیرت، 2 / 71-72 بحوالہ الاستیعاب، 2 / 431)

ابنِ سعد نے ان کے تذکرہ میں ان کی حنیفیت کے تعلق سے یہی باتیں لکھی ہیں: ''..... انی کنت فی الجاھلیۃ اری الناس علی ضلالۃ ولا اری الاوثان بشنی .....رَغِبتُ عن آلھۃ قومی فی الجاھلیۃ و ذالك انھا باطل .....فرأیت انۃ الۃ باطل لا ینفع و یضر.....'' اُن کے آخری جملہ کے پیچھے ایک خوبصورت پس منظر ہے۔ بت پرستوں کا حال بتاتے ہیں کہ ایک شخص ایسے علاقے / قوم میں جاتا جہاں اُن کا خدا نہ ہوتا تو وہ چار پتھر لاتا، تین تو چولھے کے لیے استعمال کرتا اور چوتھے کو خدا بنا لیتا اور اس سے بہتر پتھر ملتا تو اس کو ''الہٰ'' بنا لیتا اور جب سفر کرتا تو انہیں چھوڑ جاتا۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ یہ تو معبودانِ باطل ہیں۔ (ابن سعد، 4 / 214-219) ادریس کاندھلوی، سیرۃ المصطفیٰؐ، دیوبند غیر مورخہ، 1، 169-170 بحوالہ اصابۃ، 3/6، 1/72 و معجم طبرانی و دلائل ابی نعیم، نیز مسند احمد و صحیح مسلم بابت حدیث نبوی۔)

بنو غفار / کنانہ

قبیلہ کنانہ قریشِ مکہ کا حلیف بھی تھا اور قریبی عزیز بھی۔ وہ بہت بڑا قبیلہ تھا اور اس کی متعدد شاخیں تھیں۔ ان میں غفار اور اسلم کے دو قبیلے بھی تھے جو پڑوسی تھے اور مکہ مکرمہ کے قریب کے علاقے میں رہتے تھے۔ دراصل ان کا قبائلی تعلق نہ تھا کہ اسلم قبیلہ خزاعہ کا ایک بطن تھا اور غفار کنانہ کا، لیکن دونوں کا جوار و پڑوس کا تعلق تھا لہٰذا وہ ایک ہی سمجھے جاتے تھے۔ ان کا علاقہ شامی شاہ راہ تجارت کے قریب تھا۔ ان کے افراد و طبقات دونوں کا مکہ

اور مدینہ سے بہت گہرا تعلق تھا جو سیاسی بھی تھا اور سماجی بھی۔ (عہدِ نبوی میں تنظیم ریاست و حکومت، باب دوم، 126-128 اور 131 اور ان کے حواشی)

حضرت ابوذر غفاری مشہور قدیم ترین صحابی ہیں۔ وہ زمانہ جاہلیت ہی میں رواجی دین سے بے زار ہوگئے تھے۔ رسول اکرم صلّی اللہُ علیہِ وآلہِ وسلّم سے ملاقات و قبولِ اسلام سے تین سال قبل وہ بتوں کی پوجا چھوڑ چکے تھے اور اللہ کے لیے نماز پڑھنے لگے تھے۔ نماز جس طرح چاہتے پڑھتے اور جدھر اللہ رخ کردیتا اُدھر منہ کرلیتے۔ رات بھر نمازیں پڑھتے تاآنکہ صبح ہوجاتی۔ اسی زمانہ میں ان کے بھائی انیس ضرورت سے مکہ گئے تو واپس آکر حضرت ابوذر غفاری کو خبر دی کہ مکہ میں ایسے شخص سے ملا جو تمہارے دین پر ہے اور اس کا خیال ہے کہ اللہ نے اسے رسول بناکر بھیجا ہے۔
"....وقد صليت بابن اخى قبل ان القى رسول اللہؐ ثلاث سنين، فقلت: لمن؟ قال: للہ، فقلت: اين توجہ؟ قال: اتوجہ حيث يوجهنى الله، اصلى عشاء حتى اذا كان من آخر السحر القيت كانى خفاء..... قال (انيس) انى لقيت رجلا بمكة على دينك يزعم أننى الله ارسلة....." (ابن سعد، 4 / 219-220 و مابعد، مودودی، سیرت، 2 / 70) اس روایت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت ابوذر غفاری کے ایک بھتیجے بھی حنیف تھے جو ان کے ساتھ شریک نماز رہتے تھے اور غالباً ان کے بھائی انیس بھی کیوں کہ وہ بھی اسلام کی طرف سبقت کرنے والوں میں تھے اور بعض کے نزدیک پہلے اسلام لائے تھے۔ (اصابۃ تراجم انیس و ابوذر غفاری، بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب اسلام ابی ذرالغفاری، فتح الباری، 7/ 227-221)
ابنِ حجر نے صحیح مسلم کی روایت کے حوالہ سے لکھا ہے کہ قوم غفار شہر حرام کی رعایت کرتی اور عمرہ کرتی تھی "....خرجنا من قومنا غفار و كانوايحلون الشهر الحرام....." اس روایت میں ان کے نماز پڑھنے کا حوالہ ابنِ سعد کی مانند ہے اگرچہ بعض الفاظ میں فرق ہے اور حضرت انیس کا جملہ بھی: "لقیت رجلا بمکۃ علی دینک....."
حضرت عبادہ بن صامت کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ رسول اکرم صلّی اللہُ علیہِ وسلّم اور حضرت ابوبکر کو رات میں طواف کرتے دیکھا تو حضرت ابوذر غفاری نے آپ کو سلام کیا اور وہ اس باب میں اولین تھے: "....قلت: السلام عليك يارسول الله ورحمة الله وبركاته، قال: فكنت اول من حياة بالسلام....."

دوسرے قبایلی احناف

سید مودودیؒ نے تفہیم القرآن میں جن سولہ حنفاء کی فہرست دی ہے وہ غالباً ڈاکٹر جواد علی کی کتاب مذکورہ "تاریخ العرب قبل الاسلام" سے ماخوذ ہے اور ان دونوں کی اصل محمود شکری آلوسی کی تصنیف "بلوغ الارب" 2 / 244 و مابعد ہے۔ جواد علی کی فہرست احناف کے آخر میں "آخرون" (وغیرہ) کا اضافہ بھی ہے جو بہرحال موجود و مذکور ہے۔ اس فہرستِ حنفاء سے بہرحال یہ پتا چلتا ہے کہ مختلف بدوی قبایل میں ایک یا ایک سے زیادہ موحدین موجود تھے۔ ان میں مشہور ترین کا مفصل ذکر اوپر آچکا ہے۔ دوسرے غیر معروف یا کم مشہور حنفاء کا تعلق جن قبایل سے تھا، یہ ہیں: بنوالمصطلق/خزاعہ، جہینہ، بنوعدی، اسد/خزیمی، بنوتمیم، بنوکنانہ، بنوعبس، بنوقضاعہ وغیرہ۔
سوید بن عامر مصطلقی کے اشعار رسولِ اکرم صلّی اللہُ علیہِ وسلّم نے بہ روایتِ "امالی سید مرتضٰی" پڑھے تھے اور فرمایا تھا کہ وہ اگر مجھ سے ملتے تو اسلام لے آتے کیوں کہ ان کے اشعار سے پتا چلتا ہے کہ وہ حنیفیت اور ملّتِ ابراہیمیہ کی طرف مایل تھے۔ (بلوغ الارب 2/259 بحوالہ سید مرتضٰی، امالی)
عمیر بن جندب الجہنی عہد جاہلی میں ان لوگوں میں شمار ہوتے تھے جو اللہ کی توحید کے قایل تھے اور اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے تھے۔ اسلام سے کچھ پہلے ان کا انتقال ہوا۔ اس کے بارے میں صاحب قاموس نے عجیب قصہ لکھا ہے، (بلوغ الارب 2/ 261-262 بحوالہ صاحب القاموس)
عدی بن زید عبادی کا قبیلہ بنوتمیم تھا جو قبایلِ پراگندہ کا ایک عظیم ترین قبیلہ تھا اور شمال مشرقی علاقہ میں خاص سکونت رکھتا تھا۔ اگرچہ اس کی شاخیں مختلف علاقوں میں بکھری ہوئی تھیں اور ان کے طبقات متعدد شہروں میں موجود تھے، (عہدِ نبوی میں تنظیم ریاست و حکومت، باب دوم، مختلف صفحات متعلقہ)

عدی شعراے جاہلیت میں فصیح سمجھے جاتے تھے۔وہ خاندانی لحاظ سے نصرانی تھے۔اُن کے سگڑ دادا ایوب تھے جو عرب میں اس نام سے موسوم ہونے والوں میں اوّلین جانے جاتے تھے۔اُن کے شاہانِ حیرہ سے بہت گہرے تعلقات و روابط تھے۔خود عدی بن زید دیوانِ کسریٰ سے وابستہ تھے اور اولین کاتب تھے جس نے وہاں عربی زبان استعمال کی۔ان کا رجحان بھی دھیرے دھیرے حنیفیت کی طرف ہوگیا تھا، اگرچہ اس پر شک و شبہ کا اظہار کیا گیا ہے۔(بلوغ الارب 2 / 262-265)

سیف بن عدی یزن والی و شاہِ یمن کا ذکر بھی آلوسی نے اصحابِ دین میں کیا ہے۔بنیادی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے رسولِ اکرم صلّی اللہُ علیہِ وسلّم کی ولادتِ شریفہ کے چند سال بعد آپؐ کی بعثت کی بشارت آپؐ کے دادا عبدالمطّلب کو دی تھی جب وہ اکابرِ قریش کے ساتھ ان کو غیر عربوں (اہلِ حبشہ) پر فتح حاصل کرنے اور یمن میں عرب حکومت قایم کرنے کی مبارک باد دینے گئے تھے۔ان کو صاحب علم و وجدان اور اہلِ مجدّد شمار کیا گیا ہے۔غالباً قدیم کتبِ سماویہ کے عالم بھی تھے۔(بلوغ الارب، 2/ 266-269 بحوالہ ماوردی، اعلام النبوۃ، الاغانی، 2/ 29)

عامر بن الظرب العدوانی کے نام کے اسی املا کے ساتھ آلوسی نے ان کا ذکر کیا ہے۔ان کو عرب کے حکما و خطبا میں شمار کیا ہے۔ان کی ایک طویل وصیت سے ان کے افکار نقل کیے گئے ہیں۔اس میں موت، حیات، بعد موت، خالقِ سماوات ارض وغیرہ کا ذکر ہے۔ان کی حنیفیت کے لحاظ سے ان کا ذکر یہاں مختصر ہے۔زیادہ احوال و معلومات باب الحکما و الخطبا میں دیے ہیں۔(بلوغ الارب، 2/ 275-276، نیز متعلقہ باب)

عبدالطانجہ بن ثعلب بن وبرہ بن قضاعہ خالق عزوجل اور تخلیق آدم پر ایمان رکھتے تھے۔اس باب میں ان کے پانچ اشعار بھی آلوسی نے نقل کیے ہیں۔ان میں رب، قدیم اول، ماجد وغیرہ کی صفاتِ الوہی کا ذکر ہے۔دعا و استعانت کا حمد و خیر و فیض و سخاوت ربانی کا، دوسری زندگی اور اس کو عطا کرنے والے رب کا.....

ادعوك يارب بما انت اهله
دعاء غريق قد تشبث بالعُصم
لانك اهل الحمد والخير كله
وذوالطول لم تعجل بسخط ولم تلم
وانت الذى يحيه الدهر ثانيا
ولم ير عبد منك فى صالح و جم
وانت القديم الاول الماجد الذى
تبدأت خلق الناس فى اكتم العدام
وانت الذى احللتنى غيب ظلمة
الى ظلمة فى صلب (آدم) فى ظلم

علاف بن شہاب تمیمی بھی اللہ اور یومِ حساب پر ایمان رکھتے تھے۔اس بارے میں ان کے خوبصورت اشعار ملتے ہیں:

ولقد شهدت الخصم يوم رفاعة
فأخذت منه حطة المغتال
وعلمت ان الله جازِ عبده
يوم الحساب بأحسن الاعمال

المتلمس بن امیہ کنانی صحنِ کعبہ میں عربوں سے خطاب کرتے کہ "میری اطاعت کرو، ہدایت پاؤگے"، لوگوں نے پوچھا: وہ کیسے؟ فرمایا: "تم لوگوں نے بہت سے خدا بنالیے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ اللہ اس سے راضی نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ ہی ان خداؤں کا بھی رب ہے اور وہ چاہتا ہے کہ صرف اسی ایک کی عبادت کی جائے۔" عربوں نے ان کی بات نہیں سنی اور خیال کیا کہ وہ بنو تمیم کے دین پر قایم ہیں۔

زہیر بن ابی سُلمٰی ذبیانی جب بھی کانٹے دار جھاڑی کے قریب سے گذرتے تو فرماتے کہ اگر عرب مجھے برا بھلا نہ کہتے تو اس بات پر ایمان لے آتا کہ جو ذات تجھے سوکھنے کے بعد زندہ کردیتی ہے وہ ہڈیوں کے گلنے کے بعد بھی ان کو زندہ کردے گی۔ان کے معلقہ کے اشعار میں اللہ کے عالم الغیب ہونے اور سینوں کے راز جاننے والے اور یوم الحساب، حساب کتاب اور اللہ کی قدرت حیات وغیرہ کا ذکر ہے۔(بلوغ الارب، 2/ 276-278: زہیر کے لیے حوالہ زوزنی کی شرح معلقہ کا)

عبداللہ بن تغلب بن وبرہ بن قضاعہ اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے تھے اور عرب کے حکما و فضلا میں شمار ہوتے تھے۔ان کے طریقہ کو دین حنیفیت کا طریقہ کہا گیا ہے، جیسے ان کے معاصرین، سابقین وغیرہ تھے۔ان کے دینی افکار کا نمونہ ان کے کلام میں ملتا ہے۔وہ عظیم ترین فصیح و بلیغ ترین خطبا میں تھے جن کی مثال دورِ جاہلی میں شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ان کا نامِ نامی ہی وحدانیت الٰہی کی ایک مثال اور ثبوت ہے۔(بلوغ الارب، 2/ 280-281)

عبید بن الابرص اسدی خزیمی عظیم جاہلی شاعر تھے۔ابن سلام جُمحی نے ''طبقات الشعرا'' میں ان کو طبقہ چہارم میں رکھا ہے اور ان کو طُرفہ اور علقمہ بن عبدہ کا ہم پلّہ کہا ہے۔ابن قتیبہ نے ''کتاب الشعرا'' میں بیان کیا ہے کہ ان کی عمر تین سو سال سے زیادہ ہوئی تھی۔مشہور شاہِ حیرہ نعمان بن منذر کے دادا بن امری القیس سے ان کے تعلقات تھے اور ان کی ایک جنگ میں وہ مقتول ہوئے تھے۔ ان کے روابط دوسرے اکابرِ وقت سے بھی بہت عمدہ تھے۔ان کے اشعار توحیدِ الٰہی کے عقیدہ کا اثبات کرتے ہیں، مثلاً ایک شعر ہے:

ولیفنین هذا و ذاك كلاهما

الا الالہ ووجة المعبود

(بلوغ الارب، 2/ 281، نیز ملاحظہ ہو: جواد علی، مذکورہ بالا اور بحث آیذہ بر عقاید احناف)

خلاصہ:

جاہلی عہد میں دین حنیفی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے زمانے سے عربوں کا دین متین رہا، بعثت محمد سے تیین سو سال قبل تک اس کی بنادی شکل باقی رہی اور عربوں کے تمام قبائل و طبقات دین ابراہیمی کے پیرو رہے، تیسری صدی عیسوی تک جزیرہ نمائے عرب میں سچا دین حنیفی اور دین ابراہیمی قابلِ عمل اور لایق فخر اور عربوں کی دین شناخت بنا دیا، اس صدی کے اواخر تک پہنچتے پہنچتے بعض انحرافات اور خرافات و بدعات کا کچرا دین اسلام کے چشمہ صافی کو گدلا کرنے لگا، روایات بالعموم اس کی ساری ذمہ داری ایک مکی سرداد عمرو بن لحہ خزاعی کے سر ڈالتی ہیں، امکان ہے کہ کچھ دوسرے افراد طبقات نے بھی انحرافات کی راہ ہموار کی ہو، امتداد زمانہ سے دینی فکر اور مذہبی عمل میں راہِ عمل سے انحراف ایک مسلمہ حقیقت ہے،

اصل دین اور انحراف میں تصادم ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں سماج میں دینی، فکری اور عملی اتھل پتھل شروع ہوجاتی ہے، پہلے اصل دین کے پیروؤں کو غلبہ حاصل رہتا ہے اور رفتہ رفتہ انحراف کی اشاعت سے پانسہ پلٹ جاتا ہے اور انحراف غالب ہوجاتا ہے، پھر بھی اصل دین کے ماننے والے ہر دور میں باقی رہتے ہیں، یہی حقیقت دین ابراہیمی اور دین حنیفی کے ضمن مین بھی قدرت الہی نے دہرائی اور جب انحرافات نے دین اصلی کو پوری طرح مغلوب کرلیا تو بعثت نبوی کا فیصلہ الہی صادر ہوا۔

جزیرہ نمائے عبر کے طول و عرض میں تین سو سال دورِ انحراف میں بہت سے نہ سہی تو کافی تعداد میں دین حنیف کے ماننے والے موجود رہے، ان میں افراد بھی تھے اور طبقات بھی اور ان سے زیادہ اہم تھے گمراہوں میں اصل دین کے باقیات قرآنی آیات ، احادیثِ نبوی اور عرب روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ دین ابراہیمی کے بہت سے اصول و عقائد اور اعمال، معمولات انحراف کے مارے عربوں میں بھی موجود و باقی تھی، ان میں اللہ، رسول ، آخرت اعمال کی جزاء و سزاء اور دوسرے عقائد و افکار کے علاوہ بہت سے بنیادی اعمال و اشغال جیسے نماز و روزہ، زکواۃ و حج و ختنہ و غسل جنابت اور دوسرے اعمالِ فطرت پوری طرح مروج تھے۔

انحراف و بدعت سے لڑنے والے اور اصل دین حنیفی کی طرف پلٹنے والے افراد و طبقات نے فکر و عمل کی تطہیر کا کام شروع کیا، جہاں ان کو اصل دین کے بقایا مل گئے، ان کو اختیار کرلیا اور امتداد زمانہ سے جن افکار و اعمال کی صورت مسخ ہوگئ تھی اور اصل حقیقت کا پتہ لگانا ناممکن ہوگیا تھا وہاں انہوں نے فکر و عقیدہ اور عمل و مزہب کی تجریدی شکل اختیار کی اور اپنی سمجھ سے اصل کا سراغ لگایا اور اس پر عمل پیرا ہوگئے، شرک اور مشرکانہ رسول کی بجائے توحید و مواحدانہ کیش اختیار کیا، بتوں اور اصنام کی پوجا چھوڑی ان سے متعلق رسوم و اعمال سے گریز کیا اور ربِ ابراہیم علیہ السلام کی عبادت اور عبادتِ الہی سے وابستہ اشغال میں لگ گئے، اللہ واحد کے تصور اور عقیدہ نے ان کے عمل کی تطہیر میں بنیادی کردار ادا کیا۔

مکہ مکرمہ خانہ کعبہ کا گھر ہونے کے سبب دین حنیفی کا مرکز و ماویٰ بنا رہا، قریش میں ایسے افراد و جماعات ہمیشہ موجود رہے جو دین حنیفی کے علم بردار اور پیرو تھے علمائے اصولیین کا اتفاق ہے کہ رسول اکرم ﷺ جناب محمد بن عبداللہ ہاشمی کے تمام آباء و اجداد میں دین حنیفی کے بنادی افکار و اعمال ہمیشہ پیوست رہے، کئی دوسرے افراد گروہ بھی احناف کے زمرے میں شامل تھے جیسے زید بن عمرو بن نفیل عدوی، ورقہ بن نوفل اسدی، عثمان بن حویرث اسی، عبید اللہ ابن جحش اسدی خزیمی، ابو کبشہ و جز بن غالب زہری وغیرہ، مدینہ منور بھی احناف کے وجود گرامی سے کبھی محروم نہیں رہا، ان میں ابو قیس صرمہ بن انس بخاری کزرجی، ابوالہیثم بن التیہان، ذکوان بن عبد قیس، اسعد بن زرارہ اور متعدد دوسرے دین حنیفی کو زندہ رکھے ہوئے تھے،

دوسرے قبائل و طبقات عرب میں طائف و ہوازن کے بنو ثقیف، بنو سلیم، بنو سعد بن بکر، بنو کنانہ، ہمدان ، کندہ ، حِمیر، غفار، اسلم، لیث، ایاد / بنو بکر بن وائل، عبدالقیس، عبس و ذبیان، مزینہ و جہینہ، طے و اسد/ خزیمہ، حمیر و حضر موت، بنو عامر بن صعصعہ، بنو المصطلق، بنو عاد / تمیم، قضاعہ اور کئی دوسرے طبقات شامل تھے اور احناف کے وجود گرامی سے مشرف ، ان قبائل و طبقات کا جغرافیائی تعلق جزیرہ نمائے عرب کی چار سمتوں اور تمام علاقوں سے تھا، یمن اور جنوبی عرب میں حنیفی طبقات کی کثرت تھی،

احناف عرب اور دین حنیفی کے پیروؤں نے دہرا فرض انجام دیا، اس کا تعلق ماضی کی میراث کی حفاظت سے بھی تھا اور مستقبل کی تعمیر کی ہمواری سے بھی، انہوں نے دین حنیفی کو زندہ کرنے اور رواج دینے کی کوشش کی اور اسی کے ساتھ ساتھ بعثت محمدی کے ہراول دستہ کا کام کیا، عرب سماج میں یہی وہ فکری اور دینی طبقہ تھا جس نے اپنے عقیدہ و عمل سے نبی آخر الزمان ﷺ کی تشریف آوری کا منتظر ایک دنیا کو بنایا اور جب آپ ﷺ کے وجود گرامی اور ظہور سامی سے عرب کی سرزمین رشک آسمان بنی تو یہی احناف اور حنیفیت کی روح تھی جس نے سب سے پہلے بعثت محمد کو قبول کیا
.استفادہ تحریر : جاہلی عہد میں حنیفیت از پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی،(ڈائیریکٹر شاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

کیا قرآن نے امراؤالقیس کے اشعار کی نقل کی ہے ؟

ملحدوں کا مستشرقین سے نقل کردہ ایک شبہہ :
ایک ملحد لکھتا ہے۔
"امرؤ القیس زمانہ قبلِ اسلام کا ایک شاعر تھا جس کا اِنتقال سن 540ء میں ہوُا (یعنی آنخضرت محمد کی وِلادت سے بھی تیس برس پہلے اور نزول وحی سے ستر سال پہلے)۔اُس کا ایک مشہور قصِیدہ ہے جس سے قُرآنِ مجید میں بہُت سارے اِقتباسات نقل کئے گئے ہیں۔اِس کا ثبوت یہ چند اشعار ہیں:

دنت الساعة وانشق القمر عن غزال صاد قلبي ونفر

أحورٌ قد حِرتُ في أوصافه ناعس الطرف بعينيه حوَر

مرّ يوم العيد بي في زينة فرماني فتعاطى فعقر

بسهامٍ من لحاظٍ فاتك فرَّ عنّي كهشيم المحتظر

وإذا ما غاب عني ساعة كانت الساعة أدهى وأمر

كُتب الحُسن على وجنته بسحيق المسك سطراً مختصر

عادةُ الأقمارِ تسري في الدجى فرأيتُ الليل يسري بالقمر

بالضحى والليل من طرته فرقه ذا النور كم شيء زهر

قلت إذ شقّ العذار خده دنت الساعة وانشق القمر

پہلے شعر کا پہلا مصرعہ سورۃ القمر (54)، آیت 1 میں آیا ہے: ''اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانشَقَّ الْقَمَرُ۔''
تیسرے شعر کا دوسرا مصرعہ بھی سورۃ القمر (54) کی آیت 29 میں آیا ہے:''فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَى فَعَقَرَ۔''
چوتھے شعر کا دوسرا مصرعہ بھی اسی سورہ کی آیت 31میں آیا ہے: ''فَكَانُوا كَهَشِيمِ الْمُحْتَظِرِ.''
آٹھویں شعر کا پہلا مصرعہ سورۃ الضحیٰ کی آیات 1 اور 2 میں آیا ہے: ''وَالضُّحَى وَاللَّيْلِ إِذَا سَجَى.''

الجواب:
(1) قارئین کو یہ جان کر حیرانگی ہوگی کہ ان اشعار کا کوئی وجود سرے سے عربی زبان وادب کی کتابوں میں پایا ہی نہیں جاتا!
(2)دیوان امرؤ القیس کی مختلف طبعات موجود ہیں، ان میں سے کسی میں بھی یہ ابیات موجود نہیں ہیں!!
(3) عربی ادب کا کوئی بھی اسکالر اور اسپشیلسٹ، اور خاص طور پر امرؤ القیس کے اشعار کا اسپیشیلسٹ ہو، اچھی طرح جانتا ہے کہ امرؤ القیس کوئی غیر معروف شاعر نہیں تھا، نابغہ روز گار تھا، لہٰذا اس کے اشعار کو جو توجہ ملی ہے شاید ہی کسی شاعر کو ملی ہو، محدثین اور قدماء نے اس کے اشعار جمع کرنے، روایت کرنے اور اس کی نشر واشاعت پر بڑی محنت صرف کی ہے، اور اس کے دیوان کے کئی مشہور نسخے ہیں، جیسے
الأعلم الشنتمری کا نسخہ،الطوسی کا نسخہ، السکری کا نسخہ، البطلیوسی کا نسخہ، ابن النحاس کا نسخہ وغیرہ وغیرہ!!

ان ابیات کا ذکر ان میں سے کسی میں بھی موجود نہیں ہے! اب یہ امرؤ القیس کے اشعار کے ماہرین اس کے اشعار کو زیادہ جانتے ہیں یا آپ کے خائن اور جھوٹے پروپیگنڈے باز نام نہاد نقل باز محققین جن سے دشمنان اسلام و ملحدین نے یہ اشعار نقل کیے ہیں؟؟؟(یاد رہے کہ یہ جھوٹے محققین یہ سارے اعتراضات مستشرقین سے نقل کرتے ہیں)

(4) اس دور میں بھی امرؤ القیس کے اشعار اور دواوین پر نیز جو کچھ اس کی طرف منسوب کیا گیا ہے اس پر کافی ریسرچ ہوئی ہے، ان میں سے کسی بھی ریسرچ میں ان ابیات کا ذکر سرے سے موجود نہیں۔۔نہ اس طور پر کہ یہ اس کے اشعار ہیں نہ اس طور پر کہ یہ اس کی جانب منسوب کردیے گئے ہیں!!

(5) امرؤ القیس اور دیگر مشہور شعراء کی جانب پورے پورے قصائد منسوب کردیے گئے ہیں چہ جائیکہ چند اشعار، بلکہ ایسے لمبے چوڑے قصے تک گھڑ لیے گئے ہیں جن کا کوئی سر پیر ہی نہیں! اور مشہور شعراء کی جانب اشعار کا منسوب کیا جانا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ہم آج تک سامنا کررہے ہیں!!

حماد الراویۃ نامی ایک معروف اشعار کا ناقل ہے، اور اسی کی طرح خلف الاحمر! ان کا کام ہی یہ تھا کہ یہ اشعار گھڑتے اور قدیم شعراء کے نام سے بیان کرنا شروع کردیتے۔۔۔

ابن عبد ربہ نے اپنی کتاب "العقد الفرید" میں نشاندہی کے ساتھ ان من گھڑت اشعار کی مثالیں دی ہیں۔۔بلکہ خود حماد کا قول نقل کیا ہے، (فخریہ کہتا ہے) کہ کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جس کے اشعار میں میں نے اپنے اشعار کی ملاوٹ نہ کی ہو۔۔اسی طرح کی بات الصفدی نے اپنی کتاب "الوافی بالوفیات" میں بھی نقل کی ہے۔۔۔

دراصل ان لوگوں کو قدماء کے کلام پر قرار واقعی دسترس بھی حاصل تھی چنانچہ نہ انہیں کے الفاظ اور اسالیب لے کر کچھ اس طرح اشعار گھڑتے تھے کہ اچھے اچھے فرق نہ کرپاتے! آج کی طرح نہیں کہ بھونڈے اور بے وزن اشعار علامہ اقبال کی طرف منسوب کردیے جائیں!!

تو جو اشعار ملحد نے ذکر کیے ہیں، اگر کسی اور موضوع کی کسی کتاب میں امرؤ القیس کی طرف بلا کسی سند، دلیل اور حوالے کے منسوب کردیے گئے ہیں تو کون سی تعجب کی بات ہے؟

(6) بہت سے ایسے اشعار جو قدماء کی طرف کہیں منسوب کیے گئے ہیں، دوسری جگہ بالسند ان کے اصل شاعر کا نام بھی مل جاتا ہے۔۔۔روح المعانی میں آلوسی، رازی کے حوالے سے اسی طرح کے کچھ اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس کو عرب کے اشعار کی ذرہ برابر معرفت ہوگی وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کا شاعر مولد ہے (بعد کی پیداوار ہے)

(7) اہل عرب امرؤ القیس کے کلام سے آپ اور مجھ سے زیادہ واقف تھے، یہ کوئی پوشیدہ خزانہ نہیں تھا کہ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مل گیا ہو! اگر ایسا ہوتا تو اہل عرب فورا آپ پر کلام کی چوری کا الزام لگاتے!! آپ کی پوری زندگی میں آپ پر ایسا کوئی الزام نہیں لگا!!

(8) ان اشعار کی رکاکت، بے معنی پن، ترکیب کا پھسپھسا پن ان کی چغلی کھا رہا ہے۔۔بھلا الساعۃ سے کیا مراد ہے؟؟ قیامت؟؟ اطلاعا عرض ہے کہ وہ قیامت کو نہیں مانتے تھے! پورا قرآن قیامت کے سلسلے میں دلائل سے بھرا ہوا ہے! اگر وہ مانتے ہوتے تو اس کی ضرورت نہیں تھی۔۔

پھر اس انشقاق قمر سے کیا مراد ہے؟؟ انشقاق قمر کا کوئی واقعہ جاہلیت میں ہوا تھا؟؟

اگر ساعت سے ملاقات کی گھڑی مراد ہے تو اس کے ساتھ انشقاق قمر کا واقعہ ملانے سے بڑی رکاکت اور کیا ہوگی؟؟؟ انشقاق قمر سے اور کیا مراد ہوسکتا ہے؟ بھلا محبوب کے حسن کو بھی انشقاق قمر سے تشبیہ دی جاتی ہے؟؟ ہوسکتا ہے مستشرقین کے یہاں دی جاتی ہو، عربی میں تو ایسی کوئی احمقانہ تعبیر نہیں پائی جاتی۔۔۔

امرؤ القیس کے اشعار ایسے ہوتے ہیں کہ اگر عربی نہ جاننے والا بھی سنے تو جھومنے لگے۔۔اس کے مقابلے میں یہ اشعار بالکل ویسے ہی ہیں، جیسے فیس بک پر آئے دن علامہ اقبال کے نام سے ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں!!اس کا بھلا اقتربت الساعۃ انشق القمر سے کیا مقابلہ؟؟

(9) اسی طرح فتعاطی فعقر والے اشعار میں صاف طور پر یہ تعبیر قران سے چرا کر منسوب کی گئی ہے! ذرہ برابر بھی کوئی میل نہیں کھاتی اس مقام سے!! ایک طرف کہا رمانی، مجھے تیر کا نشانہ بنایا، پھر کہا تعاطی جب تیر چلا ہی دیا گیا تو اب کس چیز کی تعاطی ہو رہی ہے؟؟ اور کوچیں کیوں کاٹی جارہی ہیں؟؟

حق یہ ہے کہ یہاں یہ تعبیر صرف شعر کے قبح میں اضافہ کررہی ہے، کیونکہ یہ انتہائی بے محل ہے، اور ویسے بھی غزل میں کونچیں کاٹنے جیسی کوئی تعبیر نہیں استعمال ہوتی!! اور لفظ عقر ذبح کرنے کے معنی میں اونٹ اور گھوڑے کے سوا استعمال ہوتا ہی نہیں لغت میں۔۔ اگر اس سے مراد زخمی کرنا ہو، جیسا کہ اکثر غزل کے اشعار میں تیر نگاہ سے زخمی کرنے کی بات کی جاتی ہے، تو اس رکاکت اس کے من گھڑت ہونے کا اعلان کررہی ہے۔۔۔ جبکہ قران میں یہ تعبیر صالح علیہ السلام کی اونٹنی کے عقر کے لئے استعمال ہوئی ہے، اور اپنے محل میں ہے!!

(10) یہی حال ہشیم المحتظر والے شعر کا ہے۔۔ ہشیم محتظر کا معنی کیا ہوتا ہے؟؟ اس کا معنی ہوتا ہے باڑے وغیرہ میں بکریوں کے سموں سے روندا ہوا چارہ یا بھوسہ! فرعنی کہشیم المحتظر کا معنی ہوا مجھ سے بھاگ کھڑا ہوا باڑے میں روندے ہوئے چارے کی طرح؟؟ یہ کون سی تشبیہ ہے؟؟ صاف ظاہر ہے کہ بس الفاظ کی قوت کے سبب اسے قران سے چرا کر اشعار میں فٹ کیا گیا اور امرؤ القیس کی طرف منسوب کردیا گیا!! اس کا {إنا أرسلنا عليهم صيحة واحدة فكانوا كهشيم المحتظر} سے کیا مقابلہ؟؟

(11) جہاں سے یہ شعر نقل کیا گیا ہےوہاں یہ شعر اس طرح ہےاقتربت الساعة وانشق القمر من غزال صاد قلبي ونفر ناقل نے اس کی بے وزنی کو چھپانے کے لئے اقتربت کو دنت میں بدل دیا۔

(12) باقی یہ سارے دلائل اپنی جگہ ہیں کہ الفاظ تو ظاہر ہے قران عربی ہی کے استعمال کرے گا عبرانی کے تو نہیں کرے گا!! نیز ذرا باقی آیات کے مصادر بھی تلاش کرلائیں!

یہ من گھڑت کہانی آج کی نہیں ہے بلکہ انیسویں صدی کے آغاز ہی سے مستشرقین سے خرافات پھیلارہے ہیں!! تنویر الافہام کے نام سے ایک کتاب نصرانیت کی دعوت کے لئے لکھی گئی، یہ اشعار اسی سے چرائے گئے ہیں! ان پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ رشید رضا مصری فرماتے ہیں

" محال ہے کہ یہ اشعار کسی عربی کے ہوں، بلکہ عربی کے کسی مبتدی اور تلمیذ کے ظاہر ہوتے ہیں، لغت کے اعتبار سے انتہائی رکیک اور مختشین کی تہذیب کے حاملین کے! اپنی رکاکت اسلوب وعبارت نیز انکی عربی اور موضوع کی کمزوری کے سبب عربی بھی ان سے بری ہے چہ جائیکہ یہ جاہلی شعرا کے اشعار ہوں۔۔ (مزید اشارہ کیا ہے کہ یہ لونڈے بازوں کے اشعار ہیں، اس لئے کہ اس میں محبوب کا مذکر ہونا صاف ظاہر ہورہا ہے، جبکہ امرؤ القیس کیا کوئی بھی جاہلی شاعر لونڈے باز نہیں تھا۔) [مجلة المنار 7/الجزء 5/ص161]

مزید بھی ان اشعار میں رکاکت کے بہت سارے پہلو ہیں۔۔ جنہیں ذکر کرکے میں آپ کو بوجھل نہیں کرنا چاہتا! لہٰذا عقلا ونقلا کسی طور پر بھی یہ امرؤ القیس کے اشعار ہو ہی نہیں سکتے!!

ملحد کبھی نہیں بتا سکتا کہ اس نے جو اشعار پیش کیے یہ امراؤ القیس کا کون سا دیوان تھا؟ کس سن میں چھپا تھا؟؟ کون اس کا محقق ہے؟ کس سن میں پیدا ہوا؟ اس کا مصدر کیا تھا؟ اس سے پہلے کس کس نے ذکر کیا (یا اس پر الہام ہوا تھا؟؟)؟؟ صفحہ نمبر کیا ہے؟؟ اور کیا واقعی اس نے اسے امرؤ القیس کے اشعار کے طور پر پیش کیا ہے؟ ان سوالات کے جوابات آپ کو ملحد کبھی نہیں دے گا! کیونکہ اس کی بحث وتحقیق کا معیار یہی ہے!!

انکی سٹوریوں کی مصداقیت کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ کتنے بڑے دعوے کررہے ہیں لیکن کوئی مضبوط حوالہ نہیں، نہ کسی کتاب کا نام، نہ طبع کا نام، نہ پبلشر کا نام، نہ محقق کا نام!!

امراؤ القیس کی بیٹی کا افسانہ :

ملحد صاحب لکھتے ہیں :

سورۃ القمر کی پہلی آیت پر تبصرہ کرتے ہوئے Clair-Tisdall اپنی کتاب میں لکھتا ہے، "یہ اس زمانے کا رواج تھا کہ وہ اپنی تخلیقات کو کعبہ پر لٹکا دیا کرتے تھے جنھیں ہم سبع معلقات کے نام سے جانتے ہیں۔ روایت ہے کہ پیغمبر کی بیٹی فاطمہ ایک روز مذکورہ آیت دہراتے ہوئے گذر رہی تھی۔ اسی وقت اس کی ملاقات امراؤالقیس کی بیٹی سے ہوئی جو روتے ہوئے کہنے لگی، 'ہائے! یہ تو میرے باپ کی نظم کا ایک ٹکڑا ہے جسے تمھارے باپ نے چرا کر اسے خدا کا کلام بنا دیا۔'

جواب :

ملحد نے مستشرق ٹسڈل کا نام لیا ہے۔ یہ واقعہ William St. Clair Tisdall نے اپنی کتاب The Original Sources Of The Qur'an میں لکھا ہے۔ اس من گھڑت افسانے پر خود ٹسڈل کا ہی تبصرہ ملاحظہ فرمائیں۔

I have even "heard" a "story" to the effect that one day when Fatimah, Muhammad's daughter, was reciting thc " verse 'The Hour has come near and the Moon has split asunder" (Surah LIV., al-Qamar, 1), a daughter of the poet was present and said to her, "That is a verse from one of my father's poems, and your father has stolen it and ".pretended that he received it from God

This "tale" is probably "false", for Imrau'l Qais died about the year 540 of the Christian era, while Muhammad was ".not born till A.D. 570, "the year of the Elephant

ملحد نے مستشرق کی کتاب سے کہانی تو پیش کردی، آگے اسکا اس پر تبصرہ پیش کرنے کی جرات نہیں کرسکا کیونکہ اس سے اسکا اپنا مکر واضح ہوجاتا ۔مستشرق ٹسڈل آگے خود اسکی وضاحت کررہا ہے کہ یہ کہانی من گھڑت ہے۔

یہ ہے ملحدین کی تحقیقات کا حال! ان کی دال جھوٹ، فریب، خیانت، دجل اور مغالطہ بازی کے بغیر تو گلتی ہی نہیں!! حیرت ہے ایسے جھوٹے مکاروں پر بھی لوگ یقین کرجاتے ہیں۔!!

اس موضوع پر انگلش میں مکمل تحقیق دیکھنے کے لیے یہ لنک ملاحظہ کیا جاسکتا ہے

http://www.islamic-awareness.org/Quran/Sources/BBqais.html

ٹسڈل کی عربی کتاب کے غیر مطبوعہ نسخے کا لنک یہاں دیکھیے۔

http://almurshid.com/wp-content/uploads/SOURCES.pdf

استفادہ تحریر : مرزا احمد وسیم بیگ صاحب

کیا قرآن کا ماخذ امیہ بن ابی الصلت کی شاعری ہے؟

امیہ بن ابی الصلت قبیلہ ثقیف سے تعلق رکھنے والا مخضرمی شاعر تھااورطائف میں رہتا تھا۔اس کا باپ اوراسکی بہن فارعہ بھی شاعر تھی۔دو بیٹیاں اور کچھ قریبی رشتہ دار بھی شاعر تھے۔اس کا ایک بھائی ہذیل تھا جو محاصرہ طائف میں گرفتار ہوا اور شرک کی حالت میں مرا۔امیہ جادہ اعتدال پہ قائم ان شعراء میں سے تھا جو بتوں کی عبادت پہ بھڑک اٹھاکرتے تھے ،اللہ اور آخرت پہ ایمان رکھتے تھے ،برے اخلاق جو اس وقت جزیرۃ العرب میں رائج تھے انکو ناپسند کرتے تھے اورعرب میں مبعوث ہونے والے نبی کا انتظار کیا کرتے تھے۔بلکہ امیہ کا خیال تھا کہ وہ نبی وہی ہوگا چنانچہ وہ مذہبی شخصیات سے میل جول رکھتا تھا انکی کتابوں سے استفادہ کرتا تھا اور اپنے اشعار میں ان کتابوں کے مضامین پیش کرتا تھا۔وہ کثیر السفر اور تجارتی آدمی تھا۔

مصادر و مآخذ کا اس بات پہ اتفاق ہے کہ امیہ کفر کی حالت میں مرا ہے اور اس کا یہ کفر بر بنائے بغض و عناد تھا۔جب اسے پتہ چلاکہ وہ ممکنہ مبعوث نبی محمد ﷺ ہیں چنانچہ تو وہ طائف چھوڑ کر یمن چلا گیا اور اپنی دو بیٹیاں بھی ساتھ لیتاگیا جو یمن میں رہا کرتی تھیں اور امیہ خود جزیرۃ العرب کے مختلف ملکوں: یمن بحرین مکہ شام مدینہ اور طائف میں سفر کرتا تھا۔روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک بار مکہ آیا۔حضور ﷺ بھی ان دنوں مکہ میں ہی تھے۔وہاں اس نے حضور ﷺ سے سورہ یس سنی اور حضور کی تصدیق کی۔مشرکین مکہ نے اس کی بابت جب پوچھا تو اس نے کہا کہ محمد ﷺ حق پر ہیں۔لیکن پوشیدہ بغض و عناد نے اس کو اسلام میں داخل ہونا کا اعلان کرنے سے روک دیا۔ایک دوسری روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ اس نے دوسری بار حضور ﷺ سے ملاقات کرنے اور اسلام میں داخل ہونے کا اعلان کرنے کے مقصد سے مدینہ کا سفر کیا لیکن راستہ میں مشرکین نے اس کی راہ مار دی اور حضور ﷺ کے خلاف اس کے کینہ کو یہ بتا کر بھڑکا دیاکہ محمد ﷺ نے غزوہ بدر میں تمہارے رشتہ داروں کو قتل کیا ہے۔یہ سن کرامیہ پہلے جیسا ہوگیا اور اسکا سارا کینہ لوٹ آیا ،وہ رویا اور زمانہ جاہلیت کے دستور کے مطابق اپنی اوٹنی کے پاؤں کاٹ ڈالے۔اسی پر بس نہ کیا بلکہ مقتولین بدر کا مرثیہ کہا اور مشرکین کو مقتولین کے خون کا بدلہ لینے پہ ابھار نے لگا۔یوں وہ اسلام کو چھوڑ کر شرک اور بت پرستی کی گود میں جا بسایہاں تک کہ سن آٹھ یا نو ہجری (علی اختلاف الاقوال) حضور ﷺ کے طائف کو فتح کرنے سے تھوڑا پہلے طبعی موت مرگیا۔یہی بات زیادہ راجح ہے۔

(حوالہ : شعراء النصرانية قبل الإسلام/ ط2/ دار المشرق/ بيروت/219 وما بعدها، ود. جواد على/ المفصَّل فى تاريخ العرب قبل الإسلام/ ط2/ دار العلم للملايين/ 1978م/ 6/ 478ـ 500، وبهجة عبد الغفور الحديثى/ أمية بن أبى الصلت ـ حياته وشعره/ مطبوعات وزارة الإعلام/ بغداد/ 1975م/ 46 فصاعدا. وله تراجم فى "طبقات الشعراء"، و"الشعر والشعراء"، و"الأغانى" وغيرها)

امیہ کے دیوان میں دونوں قسم کے اشعار ر ملتے ہیں وہ اشعار بھی جنکی اسکی جانب نسبت صحیح ہے اور وہ اشعار بھی جنکی اسکی جانب نسبت صحیح نہیں ہے جنکے بارے میں یہ اطمینان نہیں ہوتا کہ یہ اسی کے اشعار ہیں بلکہ دوسری قسم کے اشعار زیادہ ہیں۔اس سے منسوب اکثر اشعار دینی مسائل پر مشتمل ہیں جیسے تکوینی نظام ،تکوینی نظام کے اللہ کے رب ہونے پر دلائل،فرشتوں کی مدح وتوصیف، فرشتوں کا پروردگار کی تسبیح کو لازم پکڑے رہنا اور اسکی مرضی پہ عمل کرتے رہنا، قیامت اور قیامت میں ہونے والے حساب ،ثواب اور سزا کی خبر دینا، انبیاء کے اپنی قوموں کے ساتھ واقعات کی حکایت۔جبکہ دوسری طرف اسکے اشعار عبد اللہ بن جدعان کی مدح میں اور اپنی ذات اور اپنے قبیلہ کے اوپر فخر پر مشتمل ہیں۔

اسکی جانب منسوب وہ دینی اشعار جو قرآن کریم سے لفظا و معنا بہت مشابہت رکھتے ہیں یہ ہیں

الحمد والنعماء والمُلْك ربنا فلاشىء أعلى منك جَدًّا وأَمْجَدُ مليكٌ على عرش السماء مهيمنٌ

لعزّته تَعْنُو الجباه وتسجدُ مليك السماوات الشِّدَاد وأرضها وليس بشىء فوقنا يتأوَدُ تسبِّحه الطير الكوامن فى الخفا

وإذ هى فى جو السماء تَصَعَّدُ ومن خوف ربى سبّح الرعدُ حمده وسبّحه الأشجار والوحش أُبَّدُ من الحقد نيران العداوة بيننا

لأن قال ربى للملائكة: اسجدوا الآدم لمّا كمّل الله خلقه فخَرُّوا له طوعًا سجودا وكدّدوا وقال عَدُوُّ الله للكِبْر والشَّقا:

لطينٍ على نار السموم فسوّدوا فأَخْرَجَه العصيان من خير منزلٍ فذاك الذى فى سالف الدهر يحقدُ

ويوم موعدهم أن يُحْشَروا زُمَرًا يوم التغابن إذ لا ينفع الحَذَرُ

مستوسقين مع الداعى كأنهمو رِجْل الجراد زفتْه الريح تنتشرُ

وأُبْرِزوا بصعيدٍ مستوٍ جُرُزٍ وأُنْزِل العرش والميزان والزُّبُرُ

وحوسبوا بالذى لم يُحْصِه أحدٌ منهم، وفى مثل ذاك اليوم مُعْتَبَرُ

فمنهمو فَرِحٌ راضٍ بمبعثه وآخرون عَصَوْا، مأواهم السَّقَرُ

يقول خُزّانها: ما كان عندكمو ألم يكن جاءكم من ربكم نُذُرُ

قالوا: بلى، فأطعنا سادةً بَطِروا وغرّنا طولُ هذا العيشِ والعُمُرُ

قالوا: امكثوا فى عذاب الله، ما لكمو إلا السلاسل والأغلال والسُّعُرُ

فذاك محبسهم لا يبرحون به طول المقام، وإن ضجّوا وإن صبروا

وآخرون على الأعراف قد طمعوا بجنةٍ حفّها الرُّمّان والخُضَرُ

يُسْقَوْن فيها بكأسٍ لذةٍ أُنُفٍ صفراء لا ثرقبٌ فيها ولا سَكَرُ

مِزاجها سلسبيلُ ماؤها غَدِقٌ عذب المذاقة لا مِلْحٌ ولا كدرُ

وليس ذو العلم بالتقوى كجاهلها ولا البصير كأعمى ماله بَصَرُ

فاسْتَخْبِرِ الناسَ عما أنت جاهلهُ إذا عَمِيتَ، فقد يجلو العمى الخبرُ

كأَيِّنْ خلتْ فيهمو من أمّةٍ ظَلَمَتْ قد كان جاءهمو من قبلهم نُذُرُ

فصدّقوا بلقاء الله ربّكمو ولا يصُدَّنّكم عن ذكره البَطَرُ

قال: ربى، إنى دعوتك فى الفجر، فاصْلِحْ عليَّ اعتمالى

إننى زاردُ الحديد على الناس دروعًا سوابغ الأذيالِ

لا أرى من يُعِينُنِى فى حياتى غير نفسى إلا بنى إسْرالِ

اعتراض کی حقیقت

ملحدین اور عیسائی مشنریوں کو یہ گمان ہے کہ اسلام، رسول اور انکی باطل (نعوذ باللہ) کتاب کے خلاف لوگوں کو جمع کرنا ہمارے بس میں ہے سو مذکورہ مشابہت کی وجہ سے مشنریاں یہ وسوسہ پیش کرتی ہیں کہ قرآن میں امیہ کے اشعار چرائے گئے ہیں۔ جبکہ جاہلی ادب کے متعدد بڑے بڑے ریسرچر ،خواہ وہ مستشرقین ہوں یا مسلمان، مشنریوں کے مذکورہ گمان کے بر عکس یہ کہتے ہیں کہ قرآن سے مشابہت رکھنے والے امیہ کے اشعار جو اسکی جانب منسوب کئے گئے ہیں غلط منسوب ہیں۔ مستشرقین میں سے یہ بات تور اندریہ، برو کلمان اور براو نے ، اور عرب علماء میں سے ڈاکٹر طہ حسین، شیخ محمد عرفہ،ڈاکٹر عمر فروخ،ڈاکٹر شوقی ضعیف ،ڈاکٹر جواد علی اور بہجہ الحدیثی نے کہی ہے۔اس کے باوجود بعض مستشرقین جیسے فرانسیسی مستشرق کلیمان ھوار کا یہ خیال ہے کہ نبی پاک ﷺ نے قرآ ن کے ایک حصہ میں امیہ کے اشعار لئے ہیں۔اور بعض مستشرقین کا یہ خیال ہے کہ حضور اور ورقہ دونوں نے ایک ہی مآخذ سے مدد لی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ المانی مستشرق کارل بروکلمان یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہتا ہے کہ امیہ کے نام سے جو اشعار روایت کئے جاتے ہیں وہ اسکی جانب غلط منسوب ہیں ماسوائے مقتولین بدر کے مرثیہ کے۔اور فرانسیسی مستشرق کلیمان ھوار جو یہ گمان کرتا ہے کہ امیہ کے اشعار قرآن کے مصادروں میں سے ایک مصدر ہے تو اس سلسلہ میں حق بات وہ ہے جو تور اندریہ نے کہی ہے کہ یہ اشعار وہ ہیں جن میں افسانہ نویسوں نے قرآنی واقعات کا وہ مٹیریل جمع کردیا ہے جسکی مفسرین نے تخریج کی ہے۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (دائرۃ المعارف الاسلامیہ) کے پہلے ایڈیشن میں مضمون" امیہ ابن ابی الصلت "کے رائٹر: براو فرانسیسی مستشرق کے الزام پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ امیہ کی جانب منسوب اشعار کی صحت مشکوک ہے ، ان اشعار کا حال عام جاہلوں کے اشعار جیسا ہے۔اور یہ قول کہ محمد نے امیہ کے اشعار سے اقتباس لیا ہے یہ ایسا گمان ہے جو ایک تفصیلی سبب کی وجہ سے بعید الاحتمال ہےاور وہ سبب یہ ہے کہ امیہ ان کہانیوں کو اچھی طرح جاننے والا تھا جن پر ہم گفتگو کر رہے ہیں۔نیز اسکی کہانیاں تفصیل میں جاکر قرآن میں وارد واقعات سے مختلف ہوجاتی ہیں۔قرآن اور امیہ کے اشعار کے درمیان مشابہت پہ تبصرہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے کہ حضور کی بعثت کے وقت اور اس سے تھوڑاپہلے ایسے فکری رجحان (معاشرہ میں) پھیل گئے تھےجو حنفاء کی رائے کے جیسے تھے ،جن افکار نے اکثر لوگوں کے دل موہ رکھے تھے، جنکو یہودیوں کی تورات کی تفاسیر اور مسلمانوں کی کہانیوں میں سے ہر دونے فروغ دیا۔

اس کے بعد براو نے ہمیں وہ بات بتائی جسکی حقیقت تک تور اندریہ پہنچا کہ امیہ کے دینی اشعار کی نسبت اسکی طرف صحیح نہیں ہے ،اس کے اشعار کا یہ (پھیکا)رنگ مفسرین کے ان اشعار کواس کی جانب غلط منسوب کرنے کی وجہ سے ہے۔(دائرۃ المعارف الإسلامیۃ/ الترجمۃ العربیۃ/ 4/ 463- 464)۔

عربی کے نامور ادیب ڈاکٹر طہ حسین لکھتے ہیں : یہ اشعار جنکی امیہ کی جانب اور حضور کے زمانہ کے حنیف شعراء کی جانب نسبت کی جاتی ہے غلط نسبت کی جاتی ہے۔انکی جانب (جاہل)مسلمانوں نے یہ غلط نسبت کی ہے تاکہ وہ اسلام کا قدیم اور سابق ہونا ثابت کرسکیں۔(فی الأدب الجاہلی/ دار المعارف/ 1958م/ 145).

شیخ محمد عرفہ :

اگر قرآن اور اشعار امیہ کے درمیان مشابہت ہوتی تو ان مشرکین کو یہ بات کہنے چاہئے تھی جنکو قرآن نے مثل لانے کا چیلنج دیا تھاکہ یہ مثل امیہ لا چکا ہے۔انہوں نے حضور ﷺ پر یہ الزام تو لگایا کہ انکو ایک عجمی غلام قرآن سکھاتا ہے مگرامیہ کتے تعلق سے انہوں نے مذکورہ بات نہ کہی۔نیز امیہ کے یہ اشعار اپنی بناوٹ میں ایام جاہلیت کے اشعار کے مشابہ نہیں ہیں کیونکہ یہ ایسے اشعار ہیں جنکی بناوٹ اور کمزوری شعراء متاخرین کے اشعار کی طرح بلکل واضح ہے۔یہیں سے یہ بات کہی گئی ہے کہ یہ اشعار جو امیہ کی جانب منسوب کئے گئے ہیں یہ غلط اور جھوٹ منسوب کئے گئے ہیں (من تعلیق الشیخ محمد عرفۃ علی مادۃ "إمیۃ بن إبی الصلت" فی "دائرۃ المعارف الإسلامیۃ"/ 4/ 465)

ڈاکٹر عمر فروخ:

"امیہ کے اشعار کی بڑا حصہ ضائع ہوچکا ہے اور مستند طور سے اس سے سوائے مقتولین بدر کے مرثیہ کے کچھ ثابت نہیں ہے "۔ایسے ہی ہم ڈاکٹر صاحب کو بھی اس بات کی توثیق کرتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ امیہ کی جانب منسوب دینی اشعار کمزور بناوٹ رکھتے ہیں انمیں کوئی رونق نہیں ہے (د.عمر فروخ/ تاریخ الأدب العربی/ ط5/ دار العلم للملایین/ 1948م/ 1/ 217- 218)۔

ڈاکٹر شوقی ضعیف:

" امیہ کا مذکورہ اشعار میں قرآن سے مدد لینا واضح طور سے ثابت ہورہا ہےمگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ امیہ قرآن سے متاثر تھا"۔بلکہ ڈاکٹر صاحب بھی اس بات کی توثیق کرتے ہیں کہ امیہ کی جانب منسوب اشعار کمزور اشعار ہیں جن کو بعض قصہ گوؤں اور واعظوں نے زمانہ جاہلیت کے بعد تیار کیا ہے۔اور فرانسیسی مستشرق کلیمان ھوار کے دعوی کی تردید کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ اس مستشرق کو عربی زبان اور زمانہ جاہلیت

کے اسالیب و طرز کا علم نہیں ہے۔اگر اس کو ان کا علم ہوتا تو اس پر یہ بات واضح ہوجاتی کہ مذکورہ اشعار غلط منسوب کئے گئے ہیں جنکا غلط منسوب کیا جانا بلکل واضح ہے (د. شوقی ضیف/ العصر الجاہلی/ ط10/ دار المعارف/ 395- 396

ڈاکٹر جواد اپنی کتاب المفصل فی تاریخ العرب میں وثوق کے ساتھ یہ بات کہتے ہیں کہ امیہ کے بعض دینی اشعار اس کے کھاتہ میں ڈالے گئے ہیں۔اسی وجہ سے یہ بات ممکن نہیں ہے کہ امیہ نے قرآن سے چوری کی ہو گی اگر اس نے چوری کی ہوتی تو حضور ﷺ اور مسلمان اس کا مذاق اڑاتے ۔ڈاکٹر صاحب کا بھی یہی خیال ہے کہ قرآن سے مشابہت رکھنے والے یہ اشعار بعد میں گھڑے گئے ہیں کیونکہ یہ نہ تورات میں ہیں نہ انجیل میں اور نہ کسی اور مذہبی کتاب میں ماسوائے قرآن کے۔اور ان اشعار کا اکثر حصہ حجاج کے زمانہ میں اس کا تقرب حاصل کرنے کیلئے گڑھا گیا ہے۔(حجاج بھی امیہ کی طرح ثقفی تھا۔راقم ابو نجمہ سعید) یہ بات بھی خاص ہے کہ امیہ کے دینی اشعار ان اشعار سے بلکل مختلف ہیں جو مدح اور مرثیہ پہ مشتمل ہیں۔ان دینی اشعار میں اسکا لہجہ فقہاء صوفیاء اور پادریوں جیسا ہے۔نیز راویوں کے اشارے بھی اس بات کی جانب بار بار ہوئے ہیں کہ امیہ کی جانب منسوب اشعار دیگر شعراء کی جانب بھی منسوب ہیں۔پھر امیہ حضور کی تعریف بھی کرتا ہے۔اسکی جانب ایسے اشعار بھی منسوب ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ حضور پر ایمان لے آیا تھا۔کیا مقتولین بدر کے مرثیہ کے ساتھ ان اشعار کی گنجائش ہے ؟ (المفصّل فی تاریخ العرب قبل الإسلام/ 6/ 491- 496)۔

میں نے نیٹ پر کتب احادیث میں وہ روایات تلاش کیں جن میں امیہ کے اشعار کا کچھ تذکرہ ملتا ہو تو مجھے ان تین اشعار کے علاوہ کچھ نہ ملا جو مسند احمد میں آئے ہیں جن میں امیہ سورج اور عرش الہی کی بابت وہ گفتگو کرتا ہے جو قرآن میں نہیں ہے جن کی حضور ﷺ نے تصدیق کی تھی

رجلٌ وثورٌ تحت رجْل یمینه   والنسر للیسریٰ، ولیثٌ مُرْصَدُ

والشمس تطلع کل آخر لیلة   حمراءَ یصبح لونها یتورّدُ

تأبَی فلا تبدو لنا فی رِسْلها   إلا مُعَذَّبةً وإلا تُجْلَدُ

مسند ابن ماجہ اور مسند احمد میں یہ بھی آتا ہے کہ ایک بار شرید بن صامت رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے سامنے امیہ کے سو اشعار پڑھے،جب شرید اشعار پڑھ کے فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا : ھیہ۔یعنی اور سناؤ۔ پھر آخر میں حضور نے تبصرہ کیا:وہ مسلمان ہونے کے قریب تھا۔مسند احمد کی ایک دوسری روایت میں یہ ہے کہ آپ نے کوئی تبصرہ نہیں فرمایا تھا بلکہ خاموش ہوگئے شرید بھی آپکی خاموشی دیکھ کر خاموش ہوگئے۔

جب میں قرآن سے مشابہت رکھنے والے امیہ کے اشعار کی تخریج کی جانب لوٹتا ہوں(جنکی تخریج بہجہ حدیثی نے اپنے رسالہ میں کی ہے)تو میری توجہ اس بات کی جانب مبذول ہوتی ہے کہ مذکورہ اشعار یا انکے علاوہ وہ اشعار جن میں تھوڑی بہت قرآن سے مشابہت پائی جاتی ہے یہ ادب، لغت اورتاریخ کی کتابوں میں اور معتبر تفاسیر میں دیکھنے کو نہیں ملتے جیسے ابو زید قرشی کی جمہرۃ اشعار العرب، ابن اسلام کی طبقات الشعراء، ابن قتیبہ کی الشعر و الشعراء، اصفہانی کی اغانی، طبری کی تاریخ الرسل و الملوک اور جامع البیان فی تفسیر القرآن۔بلکہ ان اشعار میں سے اکثر اشعار پہلے ایڈیشن میں نہیں ہیں۔مزید یہ کہ اس کے کچھ اشعار ایک ہی وقت میں دیگر شعراء کی جانب بھی منسوب ہیں

ہمارے متقدمین علماء امیہ کے اشعار اور قرآن میں مشابہت پر واقف کیوں نا ہوسکے علاوہ محمد بن داؤد انطاکی کے جو قرآن پہ امیہ کے اشعار کی چوری کا الزام لگانے والوں کی یہ کہتے ہوئےتردید کرتے ہیں کہ یہ الزام صحیح نہیں ہے۔کیونکہ یہ بات ممکن نہیں ہے کہ حضور ﷺ اپنی کتاب میں ایسے شخص کے اشعار کی مدد لے رہے ہوں جو انکی نبوت کا اقرار کرتا ہو اور انکی دعوت کی تصدیق کرتا ہو۔ بالفرض اگر ایسا ہوتا تو امیہ حضور ﷺ پر چوری کا الزام لگانے میں دیر نہ لگاتا اور یوں ذرا سی محنت سے وہ حضور ﷺ کے دعوائے نبوت کو ساقط کردیتا۔

(الزھرۃ/تحقیق د.إبراھیم السامرائی و د. نورحمود القیسی/ط2/مکتبۃ المنار/الزرقاء/1406ھ۔1985م/2/)

چند معقول سوالات

اب ہم حضور ﷺ اور امیہ کی زندگی کے ان اہم واقعات کو تلاش کرتے ہیں جن کا اس واقعہ سے تعلق بنتا ہے۔

1. سب سے پہلے تو یہ کہ امیہ بن الصلت جیسا کہ روایتوں میں آیا ہے نبی "ان ویٹنگ" کی توقع کئے ہوئے تھا۔جس وقت اسے معلوم ہوا کہ نبوت اس کے ہاتھ سے نکل گئی ہے تو وہ طائف میں اس آدمی کے قریب اپنی رہائش باقی نہ رکھ سکا جس کے بارے میں تقدیر کا فیصلہ یہ ہوا کہ وحی اس پر نازل ہو ،پس وہ اپنی دو بیٹیوں کو لیکر یمن چلا گیا۔مطلب اس کا یہ ہوا کہ شاعر : محمد کی وجہ سے ذہنی تشویش میں مبتلا تھا نہ کہ اس کا برعکس۔یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ شاعر طائف چھوڑ کر کیوں بھاگا اور محمد کا سامنا کیوں نہیں کیا؟

اگر قرآن نے اشعار امیہ سے اقتباسات لئے ہوتے تو ایسی صورت میں اس کو حضور ﷺ کا سامنا کرنا چاہئے تھا اور یہ کہنا چاہئے تھا کہ یہ جو خیالات قرآن میں آپ پیش کر رہے ہیں میں انکو پہلے ہی اپنے اشعار میں پیش کر چکا ہوں۔شاعر کے پاس یہ اس بات کی پکی دلیل ہوتی کہ محمد بر حق نبی نہیں ہیں اور میں ان سے افضل ہوں (کہ وہ میرے اشعار چرا رہے ہیں)۔اگر قرآن نے اقتباسات لئے ہوتے تو کیا عقل مذکورہ صورت حال کا تقاضہ نہیں کرتی؟جبکہ شاعر مشرکین مکہ کو خون کا بدلہ لینے پر تو ابھارتا رہا ،خودخون کے گھونٹ بھی پیتا رہا، اپنی اوٹنی کے بھی پاؤں کاٹ ڈالے مگر کبھی اس نے آگے بڑھ کر متذکرہ بالا بات نہ کہی۔

2. نبی پاک ﷺ دعوت و تبلیغ کے کام کیلئے طائف گئے تھے یہ سوچتے ہوئے کہ مکہ والے تو اس دین کو قبول نہیں کر رہے شائد طائف والے اس کو قبول کریں اور میرے ساتھ اچھا سلوک کریں مگر طائف والوں نے نہ صرف دین قبول نہیں کیا بلکہ آپ کے ساتھ انتہائی برا معاملہ کیا۔اب کومن سینس کو کام میں لائیے اور بتایئے کہ اگر امیہ نے مذکورہ اشعار کہے ہوتے اور حضور نے انکی چوری کی ہوتی تو کیا آپ ایسا کلام لے کر شاعر کے شہر جاتے؟کیا یہ اپنے پاؤں پہ خود کلہاڑی مارنے کے جیسا نہیں ہے۔نیز طائف والوں نے اس وقت کے مہمانی کے اصولوں کے خلاف شہر کے اوباشوں کو تو آپ کے پیچھے لگادیا جنہوں نے آپ کو جسمانی اور روحانی ہر طرح کی تکلیف پہنچائی،اور کونسا برا سلوک ہوگا جو انہوں نے آپ کے ساتھ نہیں برتا مگر انہوں نے نہیں کیا تو یہی کام نہیں کیا کہ حضور پہ امیہ کے اشعار کی چوری کا الزام لگاتے۔کس چیز نے ان کو یہ الزام لگانے سے روک دیا؟

3. حضور کی مدح و توصیف پہ مشتمل امیہ کے یہ اشعار دیکھیں

لك الحمد والمنّ رب العبا * د. أنت المليك وأنت الحَكَمْ
ودِنْ دين ربك حتى التُّقَى * واجتنبنّ الهوى والضَّجَمْ
محمدًا ارْسَلَه بالهدى * فعاش غنيا ولم يُهْتَضَمْ
عطاءً من الله أُعْطِيتَه * وخصَّ به الله أهل الحرمْ
وقد علموا أنه خيرهم * وفي بيتهم ذي الندى والكرمْ
نبيٌّ هدًى صادقٌ طيبٌ * رحيمٌ رءوف بوصل الرَّحِمْ
به ختم الله من قبله * ومن بعده من نبيٍّ ختمْ
يموت كما مات من قد مضى* يُرَدّ إلى الله باري النَّسَمْ
مع الأنبيا في جِنَان الخلو * دِ، هُمُو أهلها غير حلّ القَسَمْ
وقدّس فينا بحب الصلاة * جميعا، وعلّم خطّ القلمْ
كتابًا من الله نقرا به * فمن يعتريه فقدْمًا أَثِمْ
(أمية بن أبي الصلت- حياته وشعره" لبهجة عبد الغفور الحديثى/ 260- 264

ان اشعار میں امیہ نے حضور ﷺ کی تعریف کی ہے ، یہ اشعار واضح طور سے قرآن سے انسپائرڈ ہیں۔بالفاظ دیگر امیہ نے قرآن سے الفاظ لئے ہیں، اگر معاملہ اس کے بر عکس ہوتا یعنی حضور نے امیہ کے اشعار چرائے ہوتے تو امیہ کو ان اشعار میں حضور کی تعریف کرنی چاہئے تھی یا ہجو؟

4. ہمارے سامنے امیہ کی بہن فارعہ کے علاوہ شاعر کے قبیلے ثقیف سے تعلق رکھنے والے دیگر لوگ بھی ہیں۔ان دیگر لوگوں میں ایک صاحب کنانہ بن عبد یالیل ہیں۔یہ اپنے زمانہ میں قبیلہ ثقیف کے سردار تھا۔یہ اسلام کے بڑے دشمن ابو عامر کے ساتھ اسلام اور رسول کے خلاف سازش میں شریک تھا،اپنی اس سازش کو انجام تک پہنچانے کیلئے یہ دونوں قیصر روم کے پاس بھی گئے اوراسلام کے خلاف قیصر کی مدد کا وعدہ

لیا۔جب قیصر کے ہاں کامیابی نہ ملی تو ابو عامر تو شام میں ہی رک گیا اور کنانہ یہاں وہاں ٹکریں کھانے کے بعد واپس آگیا اور اسلام لانے کا اعلان کیا۔اس کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ مرتد ہوگیا تھا بعد میں دوبارہ اسلام لایا۔سوال یہ ہے کہ اگر حضور ﷺ نے امیہ کے اشعار چرائے ہوتے تو کنانہ جیسا آدمی جس نے باقاعدہ حضور کے خلاف سازش رچی اور اس سلسلہ میں سپر پاور طاقت سے ملاقات بھی کی ،کیسے خاموش رہ گیا ؟ اس کو تو یہ بات اپنے اہم ہتھیار کے طور پہ استعمال کرنی چاہئے تھی اور اس کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کے دلوں پہ حملہ کرنا چاہئے تھا اور اپنے آپکو اپنی قوم کو اور سارے جزیرۃ العرب کو حضور کے فتنہ سے نجات دلانی چاہئے تھی۔

5. شاعر کی بہن کے علاوہ لوگوں میں سے ایک عروہ بن مسعود ثقفی بھی ہیں۔یہ اپنی قوم اور قبیلہ کے اسلام لانے سے کافی پہلے اسلام لے آئے تھے ، اپنی قوم سے محبت کی وجہ سے ان کی یہ خواہش تھی کہ میری قوم بھی حضور کے ہاتھ پر ایمان لے آئے چنانچہ اس سلسلہ میں انہوں نے حضور سے اپنی قوم میں جاکر دعوت کا کام کرنے کی اجازت چاہی ،حضور نے اندیشہ ظاہر کیا کہ وہ تمہیں مار ڈالیں گے ،عروہ بن مسعود کا اپنی قوم سے محبت کی وجہ سے یہ خیال تھا کہ یہ میرے قبیلے والے ہیں میرے ساتھ ایسا سلوک نہیں کریں گے چنانچہ انہوں نے دوبارہ اجازت چاہی،حضور نے پھر اپنے اسی اندیشہ کا اظہار کیا ،انہوں نے تیسری مرتبہ اجازت چاہی تو حضور نے اجازت دے دی۔جب عروہ نے اپنی قوم میں جاکر لوگوں کو اسلام کی طرف بلانا شروع کیا تو چاروں طرف سے لوگ ان کے پاس جمع ہوگئےاور تیر مار مار کے انکو شہید کر ڈالا۔اللہ ان سے راضی ہو۔(ابو نعیم الأصفہانی/ دلائل النبوۃ/ ط2/ حیدر اٰباد الدکن/ 1950م/ 467).

یہاں کئی سوال ہیں۔اگر حضور ﷺ نے اس امیہ کے اشعار چرائے ہوتے جس کی اسلام کے خلاف سازش بہت بعد تک چلتی رہی تو کیا عروہ اپنی قوم کے دھرم کے خلاف حضور کے دین میں داخل ہو سکتے تھے ؟ داخل اگر ہو بھی گئے تھے تو حضور نے انکو دوبارہ انکی اپنی قوم میں کیوں بھیجا(چور کو تو اپنے بھانڈے کی بڑی فکر رہتی ہے۔ابو نجمہ) پھر اگر وہ چلے بھی گئے تو قوم کو انکو تیر کا زخم پہنچانے کی کیا ضرورت تھی وہ یہ کہہ کر باتوں کا زخم بھی تو پہنچا سکتے تھے کہ تم جس رسول کے دین کی جانب ہمیں بلا رہے ہو ذرا اسکی خبر تو لو۔وہ تو چور ہے اس نے ہمارے شاعر کے اشعار چرائے ہیں،اور انکو قرآن بتاکر کہتا پھرتاہے کہ یہ آسمان سے بطور وحی کے میرے پاس آیا ہے۔کیا قبیلہ ثقیف نے یہ سنہرا موقعہ اپنے ہاتھ سے گنوا نہیں دیا ؟

6. قبیلہ ثقیف سے تعلق رکھنے والوں میں ایک شاعر صاحب ابو محجن بھی ہیں جو شراب کے عادی تھے۔کئی مرتبہ ان پہ اس سلسلہ حد بھی جاری ہوئی۔حضرت عمر نے انکو جلا وطن بھی کیا تھا یہانتک کہ جنگ قادسیہ ہوئی جس میں ان کا واقعہ بڑا مشہور ہے کہ دوران جنگ انہوں نے شراب پی تھی ،اس جنگ میں مسلمانوں کے سپہ سالار سعد بن ابی وقاص کے پاس حد جاری کرنے کی فرصت نہیں تھی تو فرصت تک انہوں نے ابو محجن کو قید میں ڈال دیا تھا۔دوران جنگ وہ سپہ سالار کی اہلیہ سے بیڑی کھولنے کو لے کر اصرار کرتے ہیں تاکہ وہ بھی جہاد میں شریک ہوسکیں۔جب انہوں نے یہ وعدہ کیا کہ جنگ کے بعد میں بھاگوں گا نہیں بلکہ واپس آکر اپنے پاؤں میں خود بیڑیاں ڈال لوں گا تو اہلیہ نے بیڑیاں کھول دیں۔چنانچہ انہوں نے جنگ میں شرکت کی اور حق ادا کر دیا۔جنگ کے بعد واپس آکر وعدہ کے مطابق انہوں نے اپنے آپ کو قید میں ڈال دیا۔انکی حسن کارکردگی سے خوش ہوکر سپہ سالار سعد بن ابی وقاص نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ ان پر کبھی حد جاری نہیں کریں گےجس کے جواب میں ابو محجن نے اعلان کیا کہ وہ آئندہ کبھی شراب نہیں پئیں گے اور یہ بھی کہا کہ میں شراب اس سے پہلے چھوڑ سکتا تھا مگر اس وقت لوگ یہ کہتے کہ میں نے سزا کے ڈر سے شراب چھوڑی مگر اب کوئی یہ بات نہیں کہے گا۔دین اسلام میں شراب کی حرمت کے بغاوت کے طور پر ابو محجن کا دیوان انگور کی بیٹی کی تعریف سے بھرا پڑا ہے۔فتح مکہ کے بعد جب مسلمانوں نے طائف کا محاصرہ کیا تو مدافعت کرنے والوں میں سے ایک ابو محجن بھی تھے اور ان کا ایک تیر حضرت ابو بکر کے بیٹے کو لگا تھا۔(الزرکلی/ الأعلام/ ط3/ 5/ 243، ودائرۃ المعارف الإسلامیۃ/ الترجمۃ العربیۃ/ 2/ 597- 598، ودیوان الشاعر، وبہجۃ عبد الغفور الحدیثی/ إمیۃ بن إبی الصلت/ 42- 43).

سوال یہ ہے کہ اگر حضور ﷺ نے ان کے قبیلہ کے ایک شاعر کے اشعار چرائے ہوتے تو ابو محجن جیسے شاعر نے اس بارے میں کچھ گفتگو کیوں نہیں کی؟

7. قبیلہ ثقیف سے تعلق رکھنے والوں میں ایک صاحب حجاج بن یوسف بھی ہے جو اپنے باپ کی طرح شروع سے ہی قرآن کی تعلیم دیا کرتا تھا۔مال کیلیئے نہیں بلکہ اللہ کا ثواب حاصل کرنے کیلیئے۔ پھر یہ بنو امیہ کے بڑے گورنروں میں سے ایک بڑا گورنر بنا۔اسی نے قرآن پر اعراب وغیرہ لگوائے۔اپنی قساوت قلبی کے باوجود قرآن کی پابندی سے تلاوت کیا کرتا تھا۔لوگوں کی قرآن حفظ کرنے پہ ہر طرح سے حوصلہ افزائی کیا کرتا تھا اور حفاظ قرآن کو اپنے قریب رکھتا تھا۔ (احمد صدقی العمَد/ الحجاج بن یوسف الثقفی- حیاتہ وآراؤہ السیاسیۃ/ دار الثقافۃ/ بیروت/ 1975م/ 86- 87، 96، 474، 477- 478، وہزاع بن عید الشّمّری/ الحجاج بن یوسف الثقفی- وجہضاری فی تاریخ الاِسلام/ دار اِمیۃ/ الریاض/ 44).

سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز تھی جس نے حجاج بن یوسف کو اسلام کا اور قرآن کا اتنا پر جوش حامی بنا رکھا تھا؟ اگر اس کو ذرا سا بھی شک ہوتا تو وہ قرآن کے مصادر مآخذ کی کھوج ضرور لگاتا، خاص طور سے اس وقت جب قرآن کا مصدر اور سورس اس کے قبیلہ کے ایک فرد کو بتایا جارہا ہو، اس کے قبیلہ کےایک فرد کو نہیں بلکہ اس کے خاندان کے ایک فرد کو(امیہ حجاج کی چوتھی پشت کی نانی کی خالہ کا بیٹا ہے۔ حجاج کا نسب دیکھئے۔وجہ حضاری فی تاریخ الاِسلام" لہزاع بن عید الشّمّری/ 15)

کوئی یہاں یہ گمان نہ کرے کہ امور سیاست میں مشغول ہونے کی وجہ سے حجاج امیہ کے اشعار سے سروکار نہ رکھتا ہوگا۔کیونکہ حجاج سے یہ قول مروی ہے کہ:ذھب قوم یعرفون شعر امیه :امیہ کے اشعار جاننے والے اٹھ گئے۔(د. جواد علی/ المفصّل فی تاریخ العرب قبل الاِسلام/ 6/ 483)یہاں ایک سوال یہ بھی ہے کہ قرآن سے مشابہت رکھنے والے مذکورہ اشعار ہم تک تو پہنچ گئے جبکہ وہ شخص جو شاعر سے خون کا رشتہ رکھتا ہے اس کو ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے.

سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ امیہ کی بہن فارعہ اور ان کے بیٹے قاسم ،امیہ، ربیعہ، اور وہب اپنے قبیلہ کے ساتھ اسلام میں داخل ہوئے ہیں ۔ان میں سے قاسم،امیہ اور ربیعہ شاعری کیا کرتے تھے لیکن ان میں سے کسی سے اور نہ ان کے علاوہ ان لوگوں میں سے کسی سےجو امیہ بن ابی الصلت سے نسبی تعلق رکھتے ہیں ،کوئی ایسی بات مروی نہیں ہے جس سے یہ اشارہ ملتا ہو کہ حضور نے شاعر مذکور سے کسی بھی طرح کا استفادہ کیا ہے۔کیا ان حضرات کا اسلام کے سامنے سر نگوں ہونا بذات خود اپنے باپ کی تکذیب اور حضور سے وابستگی کی دلیل نہیں ہے؟(مصنف نے اس کا حوالہ کوئی نی دیا احباب غور فرمائیں۔سعید)۔

8. حضور ﷺ کی وفات کے بعد بہت سے قبائل مرتد ہوئے تھے۔اور ہر قبیلہ کے پاس اپنے ارتداد پر لنگڑےاعذار تھے جن کے ذریعہ سے انہوں نے اپنے ارتداد کو جواز کی شکل دینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ہم نے کبھی نہیں سنا کہ مرتد ہونے والے قبیلوں میں سے کسی قبیلہ نے مشابہت والے موضوع کو چھیڑا ہو،بلکہ قبیلہ ثقیف نے بھی ارتداد کا ارادہ کیا تھا اگر عمرو بن العاص نے انکو اس گھٹیا کام پر نفرت نہ دلائی ہوتی تو ان میں سے کوئی ہدایت کی طرف نہ لوٹتا لیکن وہ نہ صرف لوٹے بلکہ ان میں سے اکثر نے پورے اخلاص کے ساتھ مرتدین سے جنگ کی۔سوال یہ ہے کہ قبیلہ ثقیف نے ارتداد کے ارادہ کے وقت اور عمرو بن العاص کے سمجھانے کے وقت چوری والی بات کو بہانہ کیوں نہیں بنایا جبکہ یہ بہانہ بڑا معقول تھا.

9. ایک صاحب یوحنا دمشقی بھی ہیں جنکا تذکرہ ڈاکٹر جواد نے اپنی کتاب میں کیا ہے("المفصّل فی تاریخ العرب قبل الاِسلام"/ 6/ 493) یہ ان اولین عیسائیوں میں سے ہے جنہوں نے اسلام پر حملہ کرتے ہوئے کتابیں لکھیں۔حکومت بنو امیہ کا زمانہ اس کا زمانہ ہے۔اگر قرآن کو اشعار امیہ سے ذرا بھی تشابہ ہوتا تو یہ متعصب پادری اور وہ لوگ جو اسلام کو بیچ چوراہے پہ ڈھادینا چاہتے ہیں اور اپنے پورے وسائل کے ساتھ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ محمد برحق نبی نہیں تھے ایسے لوگ یہ نادر موقعہ ہاتھ سے جانے دیتے؟

اس ساری تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ نہ امیہ نے ،نہ اس کے بیٹوں میں سے کسی نے ،نہ اس کے رشتہ داروں نے، نہ اس کے قبیلہ نے، نہ عرب میں سے کسی نے ،عرب ہی نہیں بلکہ ان یہود و نصاری میں سے بھی کسی نے نہیں ،جنہوں نے حضور کا زمانہ پایا ہے یا حضور کے تھوڑے بعد آئے ہیں ،ان سب میں سے کسی نے بھی کسی بھی اسٹیج پہ قرآن کی اشعار امیہ سے مشابہت رکھنے والے معاملہ کو نہیں اٹھایا۔کیا ہمیں اب بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ مذکورہ لوگوں اور مذکورہ زمانہ کے ختم ہونے کے بعد اس معاملہ کو اٹھانے والوں کا مقصد کیا ہوگا؟

ایک احتمال بعض مستشرقین یہ بھی نکالتے ہیں کہ حضور اور امیہ دونوں نے ایک تیسرے مصدر سے چوری کی ہے۔یہ احتمال نکالنے والوں میں دیوان امیہ کا ناشر المانی مستشرق شولتس بھی ہے۔لیکن یہ ایسا احتمال ہے جس کے پاؤں نہیں ہیں۔کیونکہ اس صورت میں یہ سوال ضرور ہوگا کہ وہ تیسرا مشترک مصدر کہاں ہے؟ اتنے زمانے گذرنے کے باوجود اب تک ظاہر کیوں نہیں ہوا حضور اورامیہ بعد مکانی اور بعد روحانی رکھنے کے باوجود دونوں ایک مصدر تک کیسے پہنچے؟پھر سارے عرب کو چھوڑ کر صرف یہ دونوں ہی مصدر تک کیوں پہنچے؟ سارےعرب کو چھوڑ کرنہیں بلکہ ساری دنیا کو چھوڑ کر کہیئے۔

تو قارئین یہ تھا اس استدلال کا جواب کہ قرآن امیہ بن ابی الصلت کی شاعری کے سامنے چغلی کھاتا نظر آتا ہے۔یہ ہمارے نزدیک دس نکات سمجھنے والوں کیلیئے بہت ہیں۔اور جن کو سمجھنا نہیں ہے انکے لئے ہزار بھی ناکافی ہیں۔

تحریر: القرآن وإميّة بن إبي الصلت: من إخذ من الآخر؟ بقلم إبراهيم عوض ، ترجمہ ابونجمہ سعید، جمع و ترتیب: منیر عباسی

کیا اسلام زرتشت مذہب/پارسیت/مجوسیت سے کاپی شدہ ہے؟

گولڈ زیہر پہلا مستشرق تھا جس نے دعویٰ کیا کہ زرتشت مذہب اسلام پر اثر انداز ہوا۔(ایگناز گولڈ زیہر، اسلام پسندی اور فارسی، تاریخ مذاہب، 1901، جلد 18، ص 1-29) اس کے کام کو اس وقت بہت شہرت ملی جب اسکا انگلش میں ترجمہ کیا گیا، اسکی بنیاد پر بعد میں دوسرے مستشرقین ٹسڈل وغیرہ نے پارسیت کے اسلام پر اثر ثابت کرنے کے لیے مزید تھیوریز پیش کیں۔ اس سلسلے میں سب سے مشہور اعتراض واقعہ معراج پر ہے جس کا قرآن میں ذکر اور حدیث میں اس پر تفصیل موجود ہے ، یہ دعوی کیا گیا کہ یہ واقعہ اور اسکی تفصیلات پارسیوں کی کتاب اردہ ویراف سے چرائی گئی ہیں۔ مستشرق ٹسڈل نے اپنی کتاب 'قرآن کے اصلی ماخذ' میں دعوی کیا کہ یہ کتاب اردہ ویراف ہجرت سے چار سو سال پہلے لکھی گئی تھی۔ ابن ورق اور سٹیون مسود نے بھی یہی رائے قائم کی لیکن ان میں سے کسی نے بھی اسکا ثبوت پیش نہیں کیا۔ ہم ٹسڈل کے ان مخلص پیروکاروں میں عبداللہ عبد الفھدی ، گیسلر اورعبدالصلیب کو بھی شامل کرسکتے ہیں۔ جدید ملحدین کو ہم اس لیے اس میں شامل نہیں کرتے کہ یہ کوئی علمی لوگ نہیں بلکہ مخالفین اسلام کا اندھا مقلد اور تھوک چاٹ طبقہ ہے جسکا کام بس اسلام کی مخالفت کرنے والوں کی تحریروں کے ترجمے کرکے لوگوں کو گمراہ کرنا ہے۔

ان الزمات کا ماخذ پارسی کتاب اردہ وراف نمگ ہے۔ اردہ وراف نمگ پارسی افسانوں کا مجموعہ ہے اور ان کہانیوں میں سے ایک کہانی جو کہ اردہ وراف نامی ایک آدمی کی ہے جوکہ کچھ یوں ہے:

"ایک زمانے میں جب سرزمینِ فارس میں دوسرے مذاھب کی موجودگی بہت سی پریشانیاں اور مشکلات پیدا کر رہی تھی، اردہ وراف کو اسکی پرہیزگاری کی وجہ سے اگلے جہان کا سفر کرنے کیلیئے چُنا گیا تاکہ وہ زرتشت عقائد کی حقیقت کو ثابت کرسکے۔ اس نے ایک مہلوسہ اور شراب نوش کی جسکے بعد اسکی روح نے اگلے جہان کا سفر کیا جہاں "دن" نامی ایک حسین عورت اسکا استقبال کرتی ہے۔ چینوت پل سے گزرنے کے بعد سروش سے اسکا حساب ہوتا ہے۔ پھر اسکو وہ جگہیں دیکھائی جاتی ہیں جوکہ جنت سے باہر بنائی گئی ہیں ان لوگوں کیلیئے جو زرتشت مذھب کے عقائد پر ایمان نہ لا سکے۔ جنت میں وراف کی ملاقات "آہور مزدا" سے ہوتی ہے جو اسکو وہ روحیں دکھاتا ہے جن پر رحمت کی گئی۔ بتایا جاتا ہے کہ ہر انسان اس زندگی کا جو اس نے زمین پر بطورِ زمیندار، جنگجو، چرواہا یا کسی بھی اور شعبہ سے منسلک ہو کر گزاری، کے برعکس ایک مثالی زندگی جی رہا ہے۔ پھر اسکے حکم سے اسکو جہنم کی سیر کروائی جاتی ہے جہاں اسکو جہنمی بدبخت روحوں کو تڑپتا دکھایا جاتا ہے۔ اپنا یہ سفر مکمل کرنے کے بعد وراف کو اہورا مزدا بتاتا ہے کہ زرتشت مذھب ہی زندگی گزارنے کا واحد مکمل اور سچا راستہ ہے کہ جسکے مطابق خوشی اور تنگی میں زندگی گزاری جائے۔"

اردہ وراف نمگ کب لکھی گئی؟

ناقدینِ اسلام میں سے کسی نے بھی سورس کی نیچر ، تاریخ کی تحقیق کرنا گوارہ نہیں بلکہ دونوں واقعات کی ایک دو باتوں میں ظاہری مشابہت دیکھ کے دعوی کردیا کہ اس کہانی کو مسلمانوں نے چرایا "واقعہ المعراج" کے نام سے پیش کیا ہے۔ انکے دعوی کی بنیاد صرف یہی بات تھی کہ "اردہ وراف نمگ" '275 عیسوی' میں لکھی گئی ہے اور پہلے کو بعد پر فوقیت ہوتی۔

یہاں سوال یہ ہے کہ کیا واقعی اردہ وراف نمگ واقعی '275 عیسوی' میں ہی لکھی گئی؟

اردہ ویراف کی تاریخ :

اردہ وراف نمگ میں تاریخ کے دو نامور ناموں کا ذکر کیا گیا ہے؛

1 - عبدر بادی مرسپانداں : شاپور دوئم (309-379 عیسوی۔ ساسانی سلطنت کا دسواں بادشاہ) کا مشہور دستور اور وزیر

2 - ویہ ساپور: خسرو اول (531- 579عیسوی)کے وقت کا ایک مشہور موباد (پارسی پادری)۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اردا ویراف کہتی ہے کہ ویراف کو 'ویہ شاپور' بھی کہا جاتا تھا۔

سوالات:

1. اگر اردا ویراف 275 عیسوی میں لکھی گئی ہے تو اس میں اس کے دو سو سال اور تین سو سال بعد کے لوگوں کا ذکر کیسے آگیا ؟

2. اگر ویہ ساپور ہی ویراف ہے تو اردا ویراف 275 عیسوی میں کیسے لکھی گئی جبکہ یہ 579 عیسوی کا آدمی ہے؟

اس کا واضح مطلب ہے کہ یہ 579 عیسوی کے بعد کسی ٹائم لکھی گئی ، فریدون وھمن (Fereydun Vahman) اردہ وراف نمگ کے (انگریزی) مترجم اردہ وراف نمگ (انگریزی ترجمہ) کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ؛

"جس پیرا میں ان بزرگان کا ذکر ملتا ہے، اسکو کتاب کی صداقت بڑھانے کیلئے تبدیل کیا گیا ہے۔ یا شائد یہ شخصیات اس وقت میں جب اس کتاب (اردہ وراف نمگ) میں ترمیم کی گئی، عزت اور احترام سے یاد کئے جاتے تھے، لیکن مصنف کو تاریخ کے اس دور کا قطعاً کوئی علم نہ تھا جس میں یہ شخصیات گزریں۔"

(اردہ وراف نمگ (انگریزی ترجمہ)، مترجم فریدون وھمن [صفحہ ۱۱]

ڈاکٹر والٹر بلاردی پہلے آدمی تھے جنہوں نے اس کتاب کے متعلق یہ بات کی تھی کہ تیسری صدی میں لکھی گئی ہے' وہ بھی لکھتے ہیں کہ اسکا مکمل باب اول(1-20) بعد کی پیداوار ہے۔

(ڈاکٹر ڈبلیو۔ بلاردی، اردا ویراف نامہ The Pehlavi Book of Righteous Viraz، 1979، Biblioteca di ricerche linguistiche e filologiche ، جامع ادارہ برائے لسانیات: روم، ص 32-33، 43، 121-122)

ڈیوڈ فلیٹری اور مارٹین شیورٹز گوکہ کتاب کی ابتداء کے متعلق ڈاکٹر والٹر بلادری سے متفق ہیں لیکن موجودہ کتاب کے متعلق وہ بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ نویں صدی میں لکھی گئی۔

(D. S. Flattery and M. Schwartz, Haoma And Harmaline: The Botanical Identity Of The Indo-Iranian Sacred Hallucinogen "Soma" And Its Legacy In Religion, Language, And Middle Eastern Folklore, 1989 [Near Eastern Studies 21], University of California Press: Berkeley and Los Angles, p. 16)

تبدیلی کا عمل :

ایک مستشرق P. Gignoux (پی۔گنکس) ، لکھتا ہے :

"یہ بات سب کو معلوم ہے کہ پہلوی ادب بڑی سست روی سے پروان چڑھا، ایک اندازے کے مطابق مسلمانوں کی فتح کے بعد۔ بحر حال اس نے بہت پرانی ، ساسانیوں اور اس سے پہلی کی بھی، روایات ہم تک منتقل کی ہیں۔۔ یہ بھی غور طلب بات ہے کہ ایران میں تحریری روایات کبھی غیر مبدل ، اور آخری نہیں سمجھی گئی تھی اور نہ ہی جس سے تحریر مسلسل تبدیلی اور تحریف کا شکار رہی۔ جس کی وجہ سے ادبی تنقیدی مسائل نے جنم لیا، جن کو حل کرنے کی ضرورت ہے۔ ان مسائل میں سے سب سے غور طلب مختلف مسودات کی تواریخ کا تعین ہے۔ پہلوی ادب کے لیے متن کی ترسیل کی ایک واضح مثال 'اردا ویراف ' نامی کتاب ہے۔۔

اسی بات کی نشاندہی (Ms. Boyce) نے بھی اپنی کتاب کی ہے کہ اس کتاب کو کئی دفعہ از سرنو ترتیب دیا گیا ہے اور اس کے آخری مسودے کا تعارفی باب عربوں کی فتح کے بعد لکھا گیا تھا'۔ لیکن مذہبی پروپیگنڈا کرنے کیلئے اس وقت جو مواد ڈالا گیا تھا، جب پارسیت کو اسلام کے حملوں کے خلاف اپنا دفاع کرنا تھا 'وہ پرانا نہیں لگتا۔ فارسی کے لسانی حقائق سے یہ پتا چلتاہے کہ یہ متن 9ویں -10ویں صدی عیسوی میں از سرنو مرتب کیا گیا اور اس کے بعد ہم تک یہ تحریری مسودہ پہنچا۔

(پی۔ گنکس، کتاب اردا ویراف کے ایڈیٹر کے نام خطوط، میگزین جرمن اووینٹل سوسائٹی 1965، سپلیمنٹ 1، حصہ 3، ص 998-999)

ایرانی آزاد دائرہ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) کے مطابق:

زرتشت مذہب کی دوسری کتابوں کی طرح ،'اردا ویراف نمگ' بھی مسلسل تبدیلی کے عمل سے گزری۔یہ گمان کیا جاتا ہے کہ اسکی حتمی شکل کا ظہور 9ویں اور 10ویں صدی عیسوی میں ہوا"۔

(اردا وراف نامہ، ایران آزاد دائرہ المعارف، 1987، جلد2، روٹلیج اور کیگن پال، لندن-نیو یارک، ص 357)

ایم۔بوئس (M.Boyce) لکھتی ہیں:

"اپنی موجودہ محفوظ شکل میں یہ نثر ہے جو سادہ اور براہ راست انداز میں لکھی گئی ہے۔اور اسکا تعارفی باب عربوں کی فتح کے بعد کی تاریخ کا تعین کرتا ہے۔یہ بعد کی تبدیلی فارس میں ہوئی تھی، اور غالباً یہ صوبے کے 9ویں -10ویں صدی کی ادبی مصنوعات میں سے ہے۔

(ایم –بوئس، مشرقی فارسی ادب، کتابچہ برائے مطالعہ المستشرقین، 1968، جلد 8]ایران حصہ دوم[، ای-جے-برِل، لیڈین، ص 48)

یہی بات اردا وراف نامہ کے مشہور مترجم وہمن نے بھی لکھی ہے اور اسکے بعد لکھتے ہیں کہ لسانی تجزیہ نظریہ کی حمایت کرتا ہے۔

(ایف-وہمن، اردا وراف نمگ، دی ایرانین ڈیوائن کومینڈیا، ص 11)

پی-گنگس نے اس کتاب کا مطالعہ کیا وہ بھی اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ 9ویں- 10 ویں صدی میں لکھی گئی۔

(بوئس، مشرقی فارسی ادب، 1968،]ایران حصہ دوم[ص48)

خلاصہ :

مستشرق گولڈ زیہر سے سراغ پکڑ کے بعد کے متعصب مصنفین ٹسڈل، ابن ورق، سٹیون مسود نے یہ دعوی کیا کہ حضور صلی کے واقعہ معراج کی تفصیل پارسی کتاب اردہ ویراف سے لی گئی ہے اسکے ساتھ ان لوگوں نے یہ مفروضہ بھی گھڑا کہ یہ ساری تفصیل ہجرت کے چار سو سال یا مسلمانوں کے دور سے کئی سو سال پہلے لکھی گئی تھی۔ان باتوں کے انکی طرف سے کوئی ثبوت نہیں دیا گیا تھا۔انکے دعوں کے برعکس فارسی علوم کے علماء نے اس کتاب اسکے حوالوں اور اسکی زبان پر مکمل تحقیق کے بعد یہ ثابت کیا کہ اردا ویراف نمگ کی موجودہ کاپی اسلام کے آنے کے سو سال بعد نویں –دسویں صدی عیسویں میں لکھی گئی ہے، یہ دور پارس پر مسلمانوں کے حملے کا دور تھا اور اسکا کہانی کا مقصد جیسا کہ Gignoux نے لکھا اسلام کے خلاف پراپیگنڈہ کرنا اور پارسی مذہب کو اسلام سے برتر ثابت کرنے کی کوشش کرنا تھا۔

کیا مجوسی مذہب ایک توحیدی مذہب ہے ؟

زرتشت/ پارسی / آتش پرست/مجوسی مذہب کے ماننے والوں کا دعوی ہے کہ زرتشت مذہب کو غلط فہمی سے آتش پرستی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور مذہب زرتشت ہی دراصل دنیا کا پہلا عقیدہ توحید پر مبنی مذہب ہے۔ پارسی اکثر آتش پرست قرار دینے پر سیخ پا ہوتے ہیں۔ہم ایک اہم اور مستند پارسی ویب سائٹ کے حوالوں سے اس کی حقیقت پیش کر رہے ہیں۔

پارسی سکالر لکھتا ہے :

"آگ کی پرستش کرنا انسان کے لئے ایک قدرتی فعل ہے۔ کیوں کہ یہ کائنات کے چار بنیادی اجزاء میں سے ایک جز ہے جس سے انسانی تہذیب کے ارتقاء میں مدد ملی۔آگ ہی نے انسان کی سردی اور جنگلی جانوروں سے حفاظت کی، کھانے کو پکایا اور گندگی اور غلاظت کو ختم کیا۔ مسافروں کو راستہ دکھایا اور انسانوں کو آتش دان کے گرد اکٹھا کیا۔آگ ہی روشنی حرارت اور طاقت کا منبع ہے۔"

اسی طرح عیسائیوں کا ماننا ہے کہ تثلیث کا عقیدہ قدرتی ہے۔ بدھ مذہب کے نزدیک گوتم بدھ کی پوجا قدرتی اور ہندوؤں کے نزدیک ان گنت خداؤں کی پرستش قدرتی قرار پاتی ہے۔ یہ اسلام کا امتیاز ہے کہ اس نے انسانیت کو کسی غیر کی پرستش سے ازاد کرکے ایک اللہ کی عبادت کا درس دیا۔

زرتشت مذہب کے ماننے والے اکثر اپنی آگ کی عبادت کو اس طرح معنوی قرار دیتے ہیں جیسا کہ نمرود کے معبد میں ہمیشہ روشن رہنے والی آگ یا گرجا گھر میں روشن کئے جانے والی موم بتیاں۔ یہ محض ایک دھوکہ دینے کی کوشش ہے کہ گرجا گھروں میں روشنی کے لیے جلنی والی موم بتی کی آگ کو پارسیوں کے ہاں جلائی جانے والی آگ سے مشابہت دی جائے۔ حقیقت میں پارسی کے ہاں اپنی عبادتوں میں آگ کی پرستش کرتے ہیں، یہ انکا بنیادی نشان ہے اور خدا کا تعارف کہ وہ روشنی ، گرمی اور توانائی ہے۔ہم آگے اسکا حوالہ پیش کریں گے کہ کیسے پارسی اسکو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ آگ کی پرستش کرتے ہیں۔

زاراداشترا (زرتشت مذہب کے بانی) نے اپنے پیغمبری صحیفے میں آگ کو ایک نیا مطلب دیا۔ یہ محض آتش کدے کی آگ نہیں یا یہ ایک مخصوص خدا سے متعلق نہیں بلکہ یہ ایک عالمگیر اور روحانی آگ ہے۔زردشت کی بیان کردہ آگ کا اب ایک اخلاقی اور الوہی مطلب بھی ہے۔ یہ انصاف کی آگ ہے۔ یہ آگ "آشا" کی ایک خُدائی صفت کا نشان ہے۔اس کی تطہیری صفات اب عالمگیر ہیں اور یہ آگ ذریعہ ہے جس کے ذریعے ابدی زندگی میں گناہگاروں کی تطہیر کی جائے گی۔ یہ دانش اور آگہی کی آگ ہے۔زردشت کا اپنے صحیفے (Gathas, Yasna 31.3) میں کہنا ہے، "جس خوشی کا تو نے وعدہ کیا ہے وہ تیری باطنی آگ اور نیکی کے ذریعے حاصل ہوسکتی ہے(گھتاس)۔ایوستان میں "باطنی آگ اور نیکی" کے لئے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں (mainyu athra-cha asha-cha) انکا لفظی مفہوم ہے "بذریعہ ذہن وفہم ، بذریعہ آگ، اور بذریعہ آشا(نیکی)"۔پس جب زردشت آگ کا ذکر کرتے ہیں انکی مراد خود آگہی سے بھی ہوتی ہے۔ کیوں کہ یہ روشن خیالی کی آگ ہی ہے جس کے ذریعے خدا علم اور ہمت لوگوں کو دیتا ہے۔"

ایک دعا جو مخلص پارسی روزانہ پڑھتے ہیں (گھتاس سے اقتباس شدہ) " ، اے عقل والے، کون مجھے مجھے پناہ دے جب کہ دغاباز مجھے نقصان پہنچانے کے درپے ہوں، سوائے تیری آگ اور دانش کے (جعفری ترجمہ)" اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آگ دراصل انسان کو خدا کی طرف مرتکز کرنے والی بنیادی قوت ہے۔

پارسیوں کے ان عقائد کی روشنی میں اگر ہم انہیں توحیدی قرار دیں تو یہودی، عیسائی اور ہندو بھی توحیدی قرار پاتے ہیں۔ پارسیوں نے آگ کو خُدائی صفات کا حامل قرار دیا جیسا کہ عیسائی عیسٰی علیہ السلام کو قرار دیتے ہیں۔اور وہ دعاؤں میں آگ سے مدد مانگتے ہیں جیسا کہ ہندو دیوی دیوتاؤں سے مدد مانگتے ہیں اور وہ یہ دعوی کرتے ہیں کہ انسان کو خدا سے ملانے والی قوت آگ ہے۔ یہ تمام عقائد توحید کے بجائے شرک کے مظاہر ہیں اور تمام شرکیہ مذاہب انسانیت کو خالق سے دور کرکے مخلوق کی عبادت پر مجبور کرتے ہیں۔

مذہب زرتشت میں آگ کو خدا تک پہنچنے کا ذریعہ ہی شرک کا دروازہ ہے جو عیسائیت میں حضرت عیسٰی علیہ السلام اور حضرت مریم علیہ السلام سے دعا اور مدد مانگنے کا ہے۔

آگے چلتے ہیں :

"مقدس آگ کے تین درجے ہیں۔ زمانہ قدیم میں ہر آگ کا درجہ ایک معاشرے کے طبقے سے متعلق تھا اور ہر درجے کی الگ روحانیت اور عظمت ہے۔"

"آگ پاک اور خالص کیسے ہو سکتی ہے؟ ہر پارسی کا یہ روحانی فرض ہے کہ کائنات کے تمام اجزائے ترکیبی کو خالص رکھیں چاہے وہ مٹی ہو، ہوا ہو پانی ہو یا آگ۔ مقدس آگ وہ پاک آگ ہے جس نے کسی مردہ انسان یا کتے کو نہیں چھوا ہو۔ نہ ہی کسی انسانی مقصد مثلاً کھانا پکانے کے لئے اسکو استعمال کیا گیا ہو۔ باربی کیو کے لئے لگائی گئی آگ درحقیقت محض ایک آگ ہے پاک اور مقدس آگ نہیں۔ ایک پاک آگ، معبد کی آگ صرف اک مخصوص مقصد اور مذہبی علامت کے طور پر موجود ہوتی ہے۔ اس طرح یہ پاک قرار پاتی ہے اور مختلف رسومات کے ذریعے آگ کے تین درجوں کا تعین کیا جاتا ہے۔"

یہی دراصل شرک کی ابتداء اور انتہا ہے۔ انکی عبادت کا محور آگ ہے، یہ اسے مقدس اور پاک گردانتے ہیں اور انسان کو خدا سے ملا دینے والی والی قوت قرار دیتے ہیں، اس لیے یہ بات حیرت کا باعث نہیں ہے کہ یہ آگ کی خوشنودی کے لیے مختلف قسم کی عبادات کرتے ہیں۔

پارسی رائٹر لکھتا ہے کہ

"پارسیوں کو شروع سے آتش پرست تعبیر کیا جاتا رہا ہے جو کہ ایک تاریخی غلط فہمی ہے۔ اگر کوئی پارسیوں کو آگ کے گرد چکر لگاتے دیکھے تو لازمی سوچے گا یہ کیا عبادت کر رہے ہیں۔ مگر یہ حقیقت نہیں ہے۔ ہر پارسی یہ جانتا ہے کہ مقدس آگ محض ایک استعارہ /علامت ہے۔ ایک بنیادی اعلیٰ اور خوبصورت استعارہ/علامت جو کہ عبادت کے قابل ہے مگر بذات خود خدا نہیں ہے۔"

واقعی محض ایک علامت ؟

غور کریں تو بعینہٖ یہی عقیدہ ہمیں عیسائی مذہب میں ملتا ہے کہ مسیح اور مریم علیہم السلام کے مجسموں کے آگے سجود محض ایک علامت ہے۔ جبکہ اسکو علامت کہنا محض دھوکے بازی اور جھوٹ ہے۔ یہ خود ساختہ تعلق جو کہ مذہب زرتشت اور توحید کے مابین بنایا گیا ہے انتہائی بودا ہے درحقیقت زرتشت مذہب میں آگ محض ایک علامت نہیں ہے بلکہ پارسیوں کی مستند کتابوں کے مطابق یہ مقدس، الوہی اور خدا اور بندے کے درمیان ایک بنیادی رابطے کی قوت ہے اس لیے یہ اس قابل ہے کہ اسکی پرستش کی جائے ، یہی وہ مبالغہ آرائی ہے جو اسکی فطری وجہ ہے کہ پارسیوں کے ہاں عبادت کا نچوڑ یعنی دعا آگ سے ہی مانگی جاتی ہے۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ خود یہ پارسی ریسرچر جس کے ہم نے اوپر حوالے پیش کیے ' بھی اپنے مضمون کا اختتام اس دعا سے کرتا ہے۔

I close this essay with one of the most beautiful of Zoroastrian prayers, an excerpt from the Atash Nyayesh, or "Reverence to Fire." Though this prayer is not from the Gathas of Zarathushtra, it is still used by all the various (groups of Zoroastrians, from reformers to traditionalists. (Darmesteter translation

I bless this sacrifice and invocation, and the good offering, the beneficent offering, the offering of assistance ..." offered unto thee, O fire, son of Ahura Mazda... may you have the right wood - may you have the right incense - may you have the right food - may you have the right fuel! May you burn in this house, may you ever burn in this house, may you blaze in this house, may you increase in this house, even for a long time, till the powerful .restoration of the world, till the time of the good powerful restoration of this world

Give me, O fire, son of Ahura Mazda, lively welfare, lively maintenance, lively living, fulness of welfare, fulness of maintenance, fulness of life; Knowledge, sagacity, quickness of tongue, holiness of soul, a good memory, and the ...understanding that goes on growing and the understanding that is not acquired through learning

Give me, O fire, son of Ahura Mazda, however unworthy I am, now and forever, a seat in the bright, all-happy, ".blissful abode of the holy Ones. May I obtain the good reward, a good renown,and long cheerfulness for my soul

!Nemase-te Atarsh Mazdao Ahurahe hudhao mazishta yazata

(.Hail unto you, O fire of Ahura Mazda, O beneficent and most great guardian spirit)

دعا کا سرسری ترجمہ:

"میں اس تحریر کا اختتام ایک مشہور پارسی دعا سے کرنا چاہتا ہوں جو کہ "آگ کی عبادت" کا ایک حصہ ہے۔ گو یہ دعا گھتاس کا حصہ نہیں مگر یہ تمام پارسیوں میں بے حد مقبول ہے۔

میں پیش کرتا ہوں یہ عبادت، یہ قربانی، یہ اچھی پیشکش یہ رحمتوں بھری پیشکش تمھارے سامنے۔اے آگ، اے اھورا مزدا کے بیٹے، ہماری دعا ہے کہ تمھیں ہمیشہ درست لکڑی ملے، ہمیشہ تمھیں خوب خوشبو ملے، تمھیں ہمیشہ درست کھانا ملے، تمھیں ہمیشہ درست ایندھن ملے۔تم ہمیشہ اس گھر میں جلتی رہو۔تم ہمیشہ اس گھر میں بڑھتی رہو۔ایک لمبے عرصے تک اس دنیا کی طاقتور بحالی تک۔اس وقت تک جب تک یہ دنیا خوب طاقتور حالت پر بحال نہیں ہو جاتی۔

مجھے بخش دے اے آگ اے ایھور مزدا کے بیٹے، گوکہ میں اس قابل نہیں ہوں ' ابھی اور ہمیشہ کے لیے ایک بھرپور زندگی، فلاح اور عافیت سے بھرپور ، ایک سرگرم زندگی، مکمل فلاح، مکمل حفاظت مکمل زندگی، علم، زیرکی، فقاہت، روح کی پاکیزگی، اچھا حافظہ اور سمجھ جو بڑھتی رہے اور سمجھ جو کہ سیکھنے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

مجھے بخش دے اے آگ، اے ایھور مزدا کے بیٹے، اگر چہ میں اس قابل نہیں ہوں ، آج اور ہمیشہ کے لیے ، ایک خوش، فرحت بخش اور روشن ٹھکانہ پاؤں پاکیزہ بندوں کے مسکن میں۔ مجھے ایک عمدہ انعام ملے، ایک اچھا وقار اور شہرت اور میری روح کے لئے ایک پر مسرت ٹھکانہ۔

سلام اے ایھور مزدا کی آگ، اے مہربان سب سے بڑی محافظ روح۔"

مجھے بخش دے ، اے عیسٰی، ، اے مریم، اے جبرائیل، اے رام، اے کرشنا، اے امام، اے آگ، اے ایھور مزدا....

اگر یہ سب توحید ہے تو پھر دنیا میں شرک نام کی کوئی چیز نہیں۔عقل اور سمجھ والے یہی نشانیاں پارسی مذہب کی شرکیہ رسومات (بلخصوص نئے سال کے نوروز کے میلے کے موقع پر کی جاتی ہیں) میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔

کچھ مشنریز سے جواب بن نہیں پاتا تو جواب میں یہ جھوٹ بولتے ہیں کہ مسلمان بھی تو کعبہ کی پوجا کرتے ہیں ، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں عیسائیوں ، ہندوؤں ، پارسیوں کی طرح کی عبادت کا کوئی سسسٹم موجود نہیں ، یہاں ڈائریکٹ ایک اللہ کو پکارا جاتا ہے ، مثلا مسلمانوں کے ہاں اس طرح کا کوئی جملہ نہیں بولا جاتا

اومقدس آگ ، مجھے بخش دے

او پیاری مریم / مسیح میری مدد کر

آپ نے کبھی ایسا جملہ نہیں سنا ہوگا حتی کہ کعبہ کے طواف کے دوران بھی نہیں کہ

او کعبہ میری حفاظت فرما، او کعبہ مجھے بخش دے۔

اس موضوع پر اردو میں مکمل تحقیق جواب یہاں لنک سے ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

آخری بات :ہم یہ واضح کردیں کہ ہماری اس تحریر کا مقصد پارسی یا عیسائی مذہب کی توہین کرنا نہیں ، ممکن ہے کہ زردشت اللہ کا پیغمبر ہو اور پارسیوں نے بھی زردشت کی توحیدی تعلیمات کو عیسائیوں کی طرح شرک سے آلودہ کردیا ہو۔(زردشت مذہب کی بعض تعلیمات آسمانی مذہب کی تعلیمات سے مشابہت رکھتی ہیں اس لیے بھی یہ بات قرین قیاس لگتی ہے)۔اللہ کے تمام پیغمبروں نے یہ ہی تعلیم دی ہے کہ اللہ کے سوا کوئ اور عبادت کے لائق نہیں ہے۔

پس تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں اور سلام ہو تمام انبیاء و رسل علیہم السلام پر۔

استفادہ تحریر ویب سائیٹ :

افسانہ شیطانی آیات/قصہ غرانیق-تحقیقی جائزہ

عیسائی مشنریز اور ملحدین کے قصہ غرانیق کی آڑ میں قائم کیے گئے مفروضوں سے بہت سے مسلمان کنفیوز ہوتے ہیں۔ذیل میں اس قصے کا تحقیقی جائزہ پیش ہے۔

اعتراض :

ایک ملحد لکھتا ہے تاریخ طبری میں ہے :

رسول اللہ قریش کی اسلام سے بے رغبتی پر انتہائی افسردہ وغمگیں تھے، اور قریش کے جانب سے دعوت اسلام کو پزیرائی حاصل نہ ہونے پر سخت مایوس تھے، ان کے دل میں شدت میں سے یہ تمنا تھی کہ اللہ کی جانب سے کوئی ایسا کلام نازل ہو جو موحدین اور مشرکین کے درمیان دوری کو قربت میں تبدیل کردے۔ایک مرتبہ پیغمبر اسلام بیت اللہ میں قریش کی ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ پر اللہ کی جانب سے وحی کا نزول شروع ہو اور آپ نے سورۃ النجم کی قراءت شروع کی اور جب ان آیات تک پہنچے ("کیا تم لوگوں نے لات اور عزیٰ کو دیکھا، اور تیسری اس دیوی منات کو") تو شیطان نے آپ صلعم کی زبان سے یہ الفاظ جاری کرا دیئے تلک الغرانیق العلیٰ و ان شفاعتھن لترتجی (یعنی یہ لات اور منات بہت بلند پایہ کے بت ہیں اور یقیناً ان کی شفاعت بھی اللہ کے ہاں قبول کی جائے گی(طبری صفحہ 108)

مشرکین آپ کی زبان سے اپنے معبودین کے لئے یہ الفاظ سن کر انتہائی مسرور ہوئے۔پیغمبر اسلام نے اپنی تلاوت مکمل کرنے کے بعد سجدہ تلاوت کیا تو اس مجلس میں موجود تمام مشرکین بھی سجدہ ریز ہو گئے اور بیت اللہ میں موجود کوئی بھی مومن اور مشرک ایسا نہ بچا جو سجدہ ریز نہ ہوا ہو۔(صفحہ 109)

محمد ﷺ کے بت پرستوں کے ساتھ یہ دوستانہ تعلقات تھوڑی دیر ہی رہے ، جلد ہی انہیں بتادیا گیا کہ بتوں کی تعریف میں آیات اللہ کی طرف سے نازل نہیں ہوئیں بلکہ یہ شیطان کی طرف سے تھیں۔پھر شام کو جبرائیل پیغمبر محمد کے پاس آئے اور کہا کہ اے محمد آج تم نے کیا کیا؟ آج تم نے قریش کے سامنے وہ کلام تلاوت کیا جوتم پر اللہ کی طرف سے نازل نہیں ہوا تھا، یہ سن کر تو محمد بے حد غمگیں ہوگئے اور ان پر خشیت الٰہی کی کیفیت طاری ہو گئی۔تو اللہ کو محمد پر رحم آیا اور محمد کی تسلی کیلئے یہ آیت نازل کی۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّىٰ أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ

ترجمہ: اور ہم نے آپ سے قبل بھی جتنے رسول اور پیغمبر بھیجے ان میں سے ہر ایک (کے ساتھ یہ واقعہ ضرور پیش آیا کہ) جب انہوں نے (اللہ کے کلام کو) پڑھا تو شیطان نے ان کے پڑھنے میں اپنی جانب سے الفاظ شامل کر دیئے، پھر اللہ شیطان کے شامل کئے ہوئے الفاظ کوتو ختم کر دیتا ہے اور اپنی آیات کوبرقرار رکھتا ہے اور اللہ تو بہت ہی خبر رکھنے والا اور سیانا ہے۔(سورۃ الحج 52)

(تاریخ طبری صفحہ 108-111)(تفسیر البغوی، تفسیر سورۃ الحج آیت 52)

جواب :

1-کتاب تاریخ الرسول والملوک کے متعلق، جوکہ عموماً تاریخ الطبری کے نام سے بھی جانی جاتی ہے:

سب سے پہلے تو یہ جان لینا لازم ہے تاریخ الطبری حدیث کی کتاب نہیں ہے، اسکی صداقت کا معیار کسی بھی حدیث کی کتاب سے کہیں نیچے ہے۔درحقیقت یہ ان اوائل کتب میں سے ایک ہے جو رسولِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے متعلق خام معلومات فراہم کرتی ہے۔اس میں موجود سب کا سب لازم نہیں سچ ہی ہو۔امام طبری نے خود اسکے مقدمہ میں اس بات کو قلم بند کیا ہے۔

"میں نے اس کتاب میں جو کچھ ذکر کیا ہے اس میں میرا اعتماد اپنی اطلاعات اور راویوں کے بیان پر رہا ہے نہ کہ عقل و فکر کے نتائج پر ، کسی پڑھنے والے کو اگر میری جمع کردوں خبروں اور روایتوں میں کوئی چیز اس وجہ سے ناقابل فہم اور ناقابل قبول نظر آئے کہ نہ کوئی اسکی تک بیٹھتی ہے اور نہ

کوئی معنی بنتے ہیں تو اسے جاننا چاہیے کہ میں نے یہ سب اپنی طرف سے نہیں لکھا ہے بلکہ اگلوں سے جو بات مجھے جس طرح پہنچی ہے میں نے اسی طرح آگے نقل کردی ہے"۔

(تاریخ الطبری، جلد اول، صفحہ ۱۷)

طبری نے جو سنا ہم تک پہنچا دیا اب اسکی اندرونی ، بیرونی اور عقلی جانچ پڑتال قارئین کے ذمہ ہے۔

2- اندرونی جانچ پڑتال:

اب ان الفاظ کو پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں جنکو کہانی کے مطابق اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مبینہ طور پر انکے تناظر کیساتھ پڑھے سورت النجم کی آیات ہیں .

بھلا تم لوگوں نے لات اور عزیٰ کو دیکھا (۱۹) اور تیسرے منات کو (۲۰) (مشرکو!) کیا تمہارے لئے تو بیٹے اور خدا کے لئے بیٹیاں (۲۱) یہ تقسیم تو بہت بےانصافی کی ہے (۲۲) وہ تو صرف نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے گھڑ لئے ہیں۔ خدا نے تو ان کی کوئی سند نازل نہیں کی۔ یہ لوگ محض ظن (فاسد) اور خواہشات نفس کے پیچھے چل رہے ہیں۔ حالانکہ ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے (۲۳)

(القران ۱۹: ۵۳-۲۳)

آیت انیس اور بیس کے بعد ان جملوں کو مبینہ طور اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ منسوب کیا گیا ہے؛.

" تلک الغرانیق العُلی ، وإن شفاعتهن تُرتجَی "

'یہ بہت عالی مقام غرانیق ہیں(اونچی اڑان اور گردن والے پرندے) جن کی شفاعت کو قبول کیا جائے گا'

کوئی بھی باسانی مشاہدہ کر سکتا ہے کہ یہ الفاظ کہیں بھی اس تناظر میں آیت میں نہیں جڑتے بشرطیکہ انسان بددین نہ ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ پہلے مشرکین کی دیویوں کی تعریف کی جائے ، انکی اہمیت جتلائی جائے اور پھر بالکل اگلی آیت میں انکی مذمت بھی کردی جائے کہ تم عورتوں کو خدا سے منسوب کرتے ہو؟ پھر اگر کہانی کو سچ مان بھی لیا جائے تو کیا مشرکینِ قریش اپنے ہوش میں نہیں تھے کہ وہ محمد کیساتھ محض اسلئے سجدہ ریز ہوئے کیونکہ محمد نے انکی دیویوں کی تعریف کی تھی؟ اس سے بڑھ کر فضول بات کیا ہو سکتی ہے؟ یہ حوالہ اگر ان مبینہ آیات کے ساتھ پڑھا جائے تو بے معنی ہو جاتا ہے۔

3- بیرونی جانچ پڑتال:

یہ واقعہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلانِ نبوت کے پانچوں سال ہجرتِ حبشہ کے فوراً بعد پیش آیا۔ اور یہ سورہ نجم کی یہ آیات نازل ہوئیں۔ (تفہیم القران سورہ نمبر۵۳ ، ابو الاعلی مودودی)

اور سورہ اسراء آیات ۷۳-۷۵، جن میں کہانی کے مطابق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نصیحت کی گئی، واضح طور پر واقع معراج کے بعد نازل ہوئی ہیں جو کہ اعلانِ نبوت کے بارہویں سال پیش آیا۔ (تفہیم القران سورہ نمبر ۱۷، ابو الاعلی مودودی)

اور سورہ حج (۵۲-۲۲) جنکو کہانی میں بیان کیا گیا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بعد میں تسلی دی گئی، ہجرت کے پہلے سال میں نازل ہوئیں۔ (تفہیم القران سورہ۲۲، ابو الاعلی مودودی)

اب اگر ہم اس تمام کہانی پر یقین کریں تو اسکا مطلب ہوگا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپکے صحابہ نے اعلانِ نبوت کے پانچوں سال میں (معاذ اللہ) بتوں کی عبادت کی اور چھ سال بعد اعلانِ نبوت کے بارہویں سال میں تسلی دی گئی اور جب اللہ کے حبیب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سب پر افسوس محسوس کیا تو انکو دوبارہ کوئی دواڑھائی سال بعد ہجرت کے پہلے سال میں پھر سے تسلی دی گئی۔!!

کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی مضحکہ خیز بات ہو سکتی ہے؟ کیا یہ کسی بھی طرح ممکن ہے؟

دوبارہ یاد کرواتا چلوں کے امام طبری نے کتاب کے مقدمے میں کیا لکھا ؛

"میں نے اس کتاب میں جو کچھ ذکر کیا ہے اس میں میرا اعتماد اپنی اطلاعات اور راویوں کے بیان پر رہا ہے نہ کہ عقل و فکر کے نتائج پر ، کسی پڑھنے والے کو اگر میری جمع کردوں خبروں اور روایتوں میں کوئی چیز اس وجہ سے ناقابل فہم اور ناقابل قبول نظر آئے کہ نہ کوئی اسکی تک بیٹھتی ہے اور نہ کوئی معنی بنتے ہیں تو اسے جاننا چاہیے کہ میں نے یہ سب اپنی طرف سے نہیں لکھا ہے بلکہ اگلوں سے جو بات مجھے جس طرح پہنچی ہے میں نے اسی طرح آگے نقل کردی ہے"۔

(تاریخ الطبری، جلد اول، صفحہ ۱۷)

4- درحقیقت ہوا کیا اور اس کہانی کو بیان کسطرح کیا گیا؟

دراصل ہوا وہی تھا جو مستند احادیث کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے جیسے کہ بخاری جہاں اسکو کچھ یوں بیان کیا گیا ہے؛

" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ النجم میں سجدہ کیا تو مسلمانوں ، مشرکوں اور جن و انس سب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سجدہ کیا۔"

(صحیح البخاری ۱۰۷۱)

دراصل یہ قران کی وہ بلاغت اور خوبصورتی تھی جو اپنے کتاب الحق ہونے کی گواہی دے رہی تھی جس نے مشرکینِ مکہ کو خودبخود سورہ نجم کی آخری آیت (سجدہ) سننے پر زمین پر گرنے اور سجدہ کرنے پر مجبور کردیا۔

" تو خدا کے آگے سجدہ کرو اور (اسی کی) عبادت کرو" (سورۃ النجم)

اللہ کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپکے اصحاب نے سجدہ کیا جیسا کہ انکو اس آیت میں حکم دیا گیا تھا۔

اس واقعے کے بعد قریش کو احساس ہوا کہ وہ باعظمت قران سن کر سجدہ کر چکے تھے۔اب اس شرمندگی کو چھپانے کیلئے انہوں نے یہ کہانی گھڑ لی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دراصل انکی دیویوں کے حق میں بولا تھا اس لیے وہ (سجدہ کیلئے) راضی ہوگئے۔درحقیقت یہ وہ منافقت اور مکاری ہے جو اس من گھڑت کہانی کی اندرونی اور بیرونی جانچ پڑتال کے بعد واضح ہوجاتی ہے۔

5- مزید تنقید:

اٹھائے گئے یہ تمام نقاط اتنے قوی ہیں اور اتنے واضح ہیں کہ انکی صداقت کیلئے ہمیں روایات کے راویوں کی معتبریت کو دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی کیونکہ بیان کی گئی کہانی کسی بھی صورت حقیقت نہیں ہو سکتی بھلے کتنے ہی مضبوط راویوں کا سلسلہ کیوں نہ ہو۔لیکن عیسائی مشنریز اور ملحدین کے ان ناقص حوالاجات کو ایک جھٹکا دینے کیلئے جید علمائے امت کی ان روایات کے متعلق رائے بھی پیش کردیتے ہیں۔

ابنِ کثیر کا کہنا ہے کہ؛ 'اس روایت کے تمام روابط غیر مستند ہیں اور میں نے کوئی بھی ایسی روایت متواصل روابط کیساتھ نہیں ڈھونڈ سکا۔' (تفسیر ابنِ کثیر ۵\۴۴۲-۴۴۱)

الشوکانی لکھتے ہیں کہ؛ 'اس میں کچھ بھی حقیقت نہیں ہے اور کوئی بھی اسکے روابط ثابت نہیں ہوتے۔' (فتح القدیر ۵\۱۲۸)

ابنِ جوزی لکھتے ہیں؛ 'یہ درست نہیں ہے۔' (ذاد المیسر ۴\۳۹۱)

جب خزیمہ سے اسکے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا، "یہ کہانی زنداقہ نے گھڑی ہے۔" (تفسیرالرازی ۱۱\۱۳۴)

البیہقی کہتے ہیں؛ "یہ کہانی قواعد التقاریر سے ثابت نہیں ہے۔" (تفسیر الرازی ۱۱\۱۳۵)

قاضی عیاض کہتے ہیں؛ "یہی حقیقت کہ یہ روایت نہ ہی مستند احادیث میں جمع کی گئی اور نہ ہی کسی مستند طریقے سے مستند راوی رکھتی ہے، اسکے ضعیف ہونے کیلئے کافی ہے۔" (الشفا ۲\۱۲۵)

انکے علاوہ، امام راضی (انکی تفسیر ۱۳۵/۱۱)، قاضی ابوبکر ابن العربی (الشفاء ۱۲۶/۲)، الوسی (اپنی تفسیر ۹۹/۱۳) میں سرے سے ہی اس کہانی کی تردید کرچکے ہیں۔

6- اس کہانی کی باقی دو آیات کا جائزہ:

کسی کے ذہن میں یہ اشکال پیدا ہوسکتا ہے کہ باقی دو آیات (سورۃ الاسراء ، سورۃ الحج) پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں تنبیہہ کی گئی۔آیئے اگلی دو آیات کا بھی جائزہ لیتے ہیں اور اشکالات کی جڑ ختم کرتے ہیں۔

کہانی کے مطابق سورۃ 17 آیت نمبر 73 -75 میں نبی کریم کی مذمت کی گئی ہے .

" اور یہ (کافر) لوگ آپ کو اس چیز سے بچلانے ہی لگے تھے جو ہم نے آپ پر وحی کے ذریعہ سے بھیجی ہے تاکہ آپ اس کے سوا ہماری طرف غلط بات کی نسبت کریں اور ایسی حالت میں آپ کو گاڑھا دوست بنا لیتے۔(۷۳) اور اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ بنایا ہوتا تو آپ ان کی طرف کچھ کچھ جھکنے کے قریب جا پہنچتے۔(۷۴) (اور) اگرایسا ہوتا تو ہم آپ کوحالت حیات میں اور بعد موت کے دہرا عذاب چکھاتے پھر آپ ہمارے مقابلے میں کوئی مددگار بھی نہ پاتے۔(۷۵)"

یہ بات اس حقیقت کی نشاندہی کرتی کہ قریش نے آپ کو لالچ دینا چاہی تاکہ آپ انکے عقائد کے بابت کچھ نرمی برتیں۔اسی طرح کی کوشش وہ پہلے بھی حضور کے پاس وفد بھیج کر کر چکے تھے جس پر انکو دو ٹوک جواب ملا تھا کہ" اگر وہ میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں تو بھی میں اپنے موقف سے رستبردار نہیں ہوں گا" .

اگر آپ انکی چال میں آ جاتے تو آپ کو دہرا عذاب چکھاتے اور ایک اور اہم بات فرمائی گئی کہ" اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ بنایا ہوتا تو آپ ان کی طرف کچھ کچھ جھکنے کے قریب جا پہنچتے "یہ آیت اس بات کی نفی کرتی ہے کہ آپ کا جھکاو انکی طرف ہوا یہاں سمجھنے کے لئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ اللہ کی مدد سے کبھی کسی کے بہلاوے میں نہیں آئے اور اپنے موقف پر قائم رہے۔

مزید برآں اس من گھڑت کہانی کے مطابق جب اللہ تعالیٰ نے نے آپکی مزمت کی تو آپ مغموم ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے سورہ الحج میں آپکی دلجوئی کی.

"اور اے محمدؐ، تم سے پہلے ہم نے نہ کوئی رسول ایسا بھیجا ہے نہ نبی (جس کے ساتھ یہ معاملہ نہ پیش آیا ہو کہ) جب اُس نے تمنّا کی، شیطان اس کی تمنّا میں خلل انداز ہو گیا اِس طرح جو کچھ بھی شیطان خلل اندازیاں کرتا ہے اللہ ان کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے، اللہ علیم ہے اور حکیم"(سورۃ الحج آیت 52)

یہاں عربی کا حاص لفظ "تمنا" استعمال ہوا ہے جس کے بارے میں مولانا مودودی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے " تمنّٰی کا لفظ عربی زبان میں دو معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ایک معنی تو وہی ہیں جو اُردو میں لفظ تمنّا کے ہیں، یعنی کسی چیز کی خواہش اور آرزو۔دوسرے معنی تلاوت کے ہیں، یعنی کسی چیز کو پڑھنا۔

"تمنّا" کا لفظ اگر پہلے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ شیطان نے اس کی آرزو پوری ہونے میں رخنے ڈالے اور رکاوٹیں پیدا کیں۔دوسرے معنی میں لیا جائے تو مراد یہ ہوگی کہ جب بھی اُس نے کلامِ الٰہی لوگوں کو سنایا ، شیطان نے اس کے بارے میں طرح طرح کے شبہے اور اعتراضات پیدا کیے، عجیب عجیب معنی اس کو پہنائے ، اور ایک صحیح مطلب کے سوا ہر طرح کے اُلٹے سیدھے مطلب لوگوں کو سمجھائے۔

پہلے معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شیطان کی خلل اندازیوں کے باوجود آخر کار نبی کی تمنا کو(آخری نبی کی تمنا اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی مساعی بار آور ہوں اور اس کا مشن فروغ پائے) پورا کرتا ہے اور اپنی آیات کو (یعنی ان وعدوں کو جو اس نے نبی سے کیے تھے) پختہ اور اٹل وعدے ثابت کر دیتا ہے۔دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات و اعتراضات کو اللہ رفع کر دیتا ہے اورایک آیت کے بارے میں جو الجھنیں وہ لوگوں کے ذہنوں میں ڈالتا ہے انہیں بعد کی کسی واضح تر آیت سے صاف کر دیا جاتا ہے۔

ان سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان آیات کا اس کہانی سے کوئی تعلق نہیں۔

خلاصہ :

مندرجہ بالا تمام نکات یہ ثابت کرتے ہیں یہ کہانی قطعی طور پر بے بنیاد اور من گھڑت ہے۔پہلے بھی کئی لوگوں نے اسے تحریر کیا لیکن انھوں نے اسکی قبولیت کو اس کے اندرونی اور بیرونی ، عقلی جانچ پڑتال اور تنقیدی جائزے سے مشروط رکھا۔اوپر ہم نے اسی انداز میں اس قصے کا جائزہ پیش کیا ہے جس سے یہ واضح طورپر ثابت ہورہا ہے کہ یہ واقعہ من گھڑت اور بے بنیاد ہے۔

تحریر وقار اکبر چیمہ

قصہ غرانیق اور حافظ ابن حجرؒ کی رائے کا جائزہ:

ملحدین و مستشرقین غرانیق کے واقعہ کے ضمن میں حافظ ابن حجرؒ کے قول کو پیش کرتے ہیں کہ کثرت طرق سے واقعہ کا وجود اصل ثابت ہوتا ہے اور حافظ ابن حجر نے باقی روایات کی تضعیف کرتے ہوئے اثبات میں مرسل روایات کو پیش کیا ہے"

آئندہ آنے والی سطور میں صرف اس بات کا جائزہ لیاجائے گا کہ ملحدین غرانیق کے واقعہ کے ضمن میں حافظ ابن حجرؒ کے قول سے استدلال کرتے ہیں اس قصہ کی اسناد پر کئی علماء نے رد کیا اور اس واقعہ کی اسناد کو ضعیف قراردیا جبکہ حافظ ابن حجرؒ نے ان پر رد کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ کثرت طرق سے واقعہ کا وجود واصل ثابت ہوتی ہے، اور باقی روایات کی تضعیف کرتے ہوئے اثبات میں مرسل روایات کو پیش کیا، یہی وہ مقام ہے جو ملحدین کے لئے قابل استدلا ل بن گیا لیکن یہ قاعدہ اتنا عام نہیں ہے کہ کثرت طرق سے کسی بھی چیز کی کم از کم اصل ثابت ہو جاتی ہو۔چنانچہ حافظ ا بن صلاحؒ مقدمہ علوم حدیث ص 37/36 پر لکھتے ہیں ، جسکا خلاصہ پیش ہے:

" حدیث میں وارد ہر ضعف کثرت طرق سے دور نہیں ہوتا۔جو ضعف راوی کے حافظہ کی وجہ سے آیا ہو یا کسی مرسل روایت کا ضعف دوسری ایسی مرسل روایت سے آیا ہوجن کو کسی امام حافظ نے ذکر کیا ہو، یہ ضعف ایسے ہیں جو قلیل ہیں اوردوسرے طرق سے ذکر کرنے سے ختم ہوجاتے ہیں۔اور کچھ ضعف ایسے ہیں جو کثرت طرق سے بھی ختم نہیں ہوتے جیسے کہ ایسا ضعف جو راوی پر تہمت کذب کی وجہ سے آیا ہو یا حدیث کے شاذ ہونے کی وجہ سے آیا ہو۔(مقدمہ علوم حدیث ص 37/36)

لہٰذا یہ معلوم ہو اکہ ہر ضعف کثرت طرق سے دور نہیں ہوتا ، توسوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک مرسل روایت سے دوسری مرسل روایت کو تقویت مل سکتی ہے ؟ جیسا کہ حافظؒ نے دو مراسیل کو جمع کیا ہے: اس کے لئے دو باتوں کا جاننا ضروری ہے :

1. ابن صلاحؒ علوم حدیث میں لکھتے ہیں : مرسل روایت کا حکم حدیث ضعیف کا ہے ، الا یہ کسی دوسری صحیح وجہ سے وہ روایت آجائے۔۔۔۔۔۔۔اور ہم نے جو مذہب ذکر کیا ہے کہ مرسل روایت سے استدلال نہیں کیا جائے گا اوریہ ضعیف ہے، یہی مذہب جماہیر محدثین کا ہے اورانہوں نے اپنی تصانیف میں اسی کورائج کیا ہے۔(ص (58))

2. دوسری یہ بات جاننا ضروری ہے کہ مرسل روایت سے محدثین کیوں استدلال کو صحیح نہیں سمجھے ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں واسطہ(یعنی راوی جو ذکر نہیں ہوتا اس) میں جہالت ہوتی ہے ،چنانچہ خطیب بغدادی (الکفایہ فی علم الروایہ : ص:287) پر لکھتے ہیں :

" مرسل غیر مقبول ہیں اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اس میں راوی میں جہالت ہے ، اس جہالت کی وجہ سے اس کی عدالت کا علم نہیں ہوسکتا ، اور یہ بات پہلے بیان کردی کہ روایت کو صرف اسی سے قبول کیا جائے گا جس کی عدالت کا علم ہو، اس سے معلوم ہواکہ وہ (مرسل) مقبول نہیں ہے،اور یہ بھی کہ جو راوی اس کو مرسل بیان کر رہا ہے ، اس کی تعدیل سے عدالت ثابت نہیں ہوگی ، اس کی بات تسلیم کرنا ضروری نہیں کیونکہ کسی غیر کے بتلانے سے عدالت ثابت نہیں ہوتی۔

خود حافظ ابن حجرؒ شرح نخبۃ الفکر (ص 17) میں حدیث مرسل کو مردود احادیث کی اقسام میں شمار کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

" اس کو مردود کی قسم میں محذوف (راوی) کے حال کی جہالت کی وجہ سے ذکر کیا ہے، کیونکہ اس میں بہت زیادہ احتمالات ہیں ہوسکتا ہے کہ محذوف صحابی ہو، ہو سکتا ہے تابعی ہو، پھر یہ بھی ہو سکتا ہے ضعیف ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے ثقہ ہو، پھر یہ بھی ممکن ہے کہ محذوف نے اس کو آگے کسی

اور صحابی سے لیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کسی اور تابعی سے لیا ہوا، بہر حال اس میں بہت زیادہ احتمالات ہیں۔۔۔اگر کسی تابعی کی یہ عادت معروف ہو کہ وہ کسی ثقہ کے علاوہ سے روایت نہیں کرتے تب بھی جمہور کا موقف یہ ہے کہ احتمال کی وجہ سے اس میں توقف کیا جائے گا۔(خلاصہ)

جب یہ بات مسلم ہوئی کہ حدیث مرسل مطلق مقبول نہیں ہوتی اور سبب اس کا محذوف راوی کی حالت کی جہالت ہے، لہٰذا یہ کہنا کہ ایک مرسل روایت کو دوسری مرسل روایت پہ تقویت ملتی ہے یہ مضبوط نہیں ، کیونکہ اس میں یہ احتمال موجود ہوتا ہے کہ ایک مرسل روایت کا راوی جس سے محذوف راوی سے روایت کرتا ہے دوسری مرسل روایت میں بھی اسی محذوف راوی سے روایت لی جا رہی ہو، اسی وجہ سے امام شافعیؒ نے دوسری مرسل روایت میں یہ شرط لگائی ہے کہ اس کے راوی پہلی مرسل روایت کی تابعی کے راویوں کے علاوہ ہوں،یہ شرط امام شافعیؒ کے علاوہ امام ابن تیمیہؒ نے بھی لگائی ہے۔

اس بحث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ مرسل احادیث کے بارے میں راجح بات یہ ہے کہ ان میں سے بعض مقبول ، بعض مردود اور بعض موقوف ہیں، لہٰذا جس کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ یہ صرف ثقہ سے مرسل کرتے ہیں تو اس راوی کی مراسیل مقبول ہونگی، اور جس کے بارے میں یہ بات معلوم ہو کہ یہ ثقہ اور غیر ثقہ دونوں طرح کے راویوں سے روایت کرتے ہیں اور ارسال ایسا ہو جس کا حال معلوم نہ ہو سکتا ہو، تو وہ مرسل موقوف ہونگی، ان دونوں قسموں کی مراسیل اگر ثقات کے مخالف ہوں تو وہ مردود ہوتی ہیں۔

لہٰذا یہاں تک مرسل (جس کے طرق زیادہ ہوں)کے بارے میں خلاصہ یہ ہوا کہ ان سے استدلال سے دو باتیں مانع ہوتی ہیں

: 1) ممکن ہے مراسیل میں ایک ہی محذوف راوی سے روایات مروی ہوں۔

2) راوی (محذوف) کثیر ہوں لیکن وہ سارے (سخت) ضعیف ہوں۔

اب ان اصولوں کے بعد اگر اس قصہ کی تمام روایات کو دیکھا جائے تو یہ ساری کی ساری مرسل ہیں، سوائے حدیث ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیکن اس کے تمام طریق میں شدید قسم کا ضعف ہے، ایسا ضعف ہے جو ان مراسیل سے بھی دور نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا اس وجہ سے ان روایات پر اعتماد اور ان سے استدلال بالکل باطل ہے حتی کے اس قصے کی تردید امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں کی ہے۔امام ابو بکر احمد بن الحسین البیھقیؒ نے فرمایا کہ یہ قصہ نقل کے اعتبار سے ثابت نہیں ہے۔

اس قصہ پر ابن العربیؒ اور قاضی عیاضؒ نے سخت رد کیا لیکن حافظ ابن حجرؒ نے ان دو حضرات کی تردید میں جو بات پیش کی وہ قوی نہیں کیونکہ یہ مطلق ہے ہاں یہ ان لوگوں پر رد ہو سکتا ہے جو مطلق مراسیل کے مقبول ہونے کے منکر ہیں، جو لوگ مطلق مراسیل کے مقبول ہونے کے منکر نہیں ان پر یہ رد بھی نہیں، یہی وجہ ہے کہ امام ابن کثیرؒ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے :

"مفسرین نے یہاں پر غرانیق کا قصہ ذکر کیا ہے اور یہ کہ مہاجرینِ حبشہ کا قریش مکہ کو مسلمان سمجھ کر لوٹے کا ذکر کیاہے، لیکن اس کے طرق سارے مرسل ہیں میں نے اس کو کسی صحیح طریقہ سے مسند نہیں دیکھا"۔(تفسیر ابن کثیر ج :3، ص :229)

اس عبارت سے یہ بات بالکل واضح ہوتی ہے کہ امام ابن کثیرؒ کے سامنے اس واقعہ کی مراسیل موجود تھیں، اور وہ ایسی تھیں جو ایک دوسرے کے ضعف کو دور کر کے درست نہیں کرتی تھیں، اسی وجہ سے انہوں نے اس کی صحت کا انکار کیا۔

اگر ایک لمحے کے لئے یہ بات مان بھی لی جائے کہ حافظ ابن حجرؒ کی ذکر کردہ مراسیل درست ہیں اوراس واقعہ کی اصل ہے تو پھر حافظ ابن حجرؒ کی پیروی صرف یہاں تک ہی کیوں کی جاتی ہے ؟ اس کے بعد جو کچھ انہوں نے فرمایااس سے نظریں چرانا قطعاً دیانت نہیں ، حافظ ابن حجرؒ خود فرماتے ہیں کہ جب یہ ثابت ہوگئیں تو اس کی تاویل واجب ہے۔تو پھر اس واقعہ میں مختلف علماء کی مختلف توجیہات ذکر کرنے کے بعد ایک تاویل پر وہ اعتماد فرماتے ہیں اوراس کو بہترین تاویل فرماتے ہوئے اسے ہی راجح قرار دیتے ہیں، وہ تاویل یہ کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے " تمنی" کی تفسیر"تلا" سے منقول ہے، لہٰذا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حافظ ابن حجرؒ کے نزدیک شیطان نے نبی ﷺ کی زبان سے یہ کلمے نہیں پڑھائے تھے بلکہ آنحضرت ﷺ کے سکتہ کے دوران اپنی زبان سے پڑھے تھے۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ اس واقعہ میں بنیادی اختلا فی جو بات ہے کہ شیطان نے نبی ﷺ (العیاذ باللہ) کی زبان سے یہ کلمات پڑھوائے تھے ، اس کو حافظ ابن حجرؒ بھی تسلیم نہیں کرتے ، اس لئے کہ حافظ ابن حجرؒ نے اس کا صراحتاً رد کیا ہے اور آنحضرت ﷺ کو اس سے منزہ قرار دیا ہے۔اب جو حضرات حافظ ابن حجرؒ کی بات سے استدلال کرتے ہیں اگر ہم حافظ ابن حجرؒ کے اختیار کردو موقف کو علمی پیراہے میں نہ بھی ڈالیں اور علی سبیل التنزل ان کی بات کو تسلیم کرلیں تو جس بات کے ثبوت کے لئے وہ حافظ ابن حجرؒ کی پناہ گاہ میں آنا چاہتے ہیں حافظ ابن حجرؒ خود اس کا رد کرتے ہیں ۔لہٰذا منصفین کے لئے اس میں سمجھنے کے لئے کافی مواد ہے اور متعصبین سے معذرت۔

گزشتہ تحریر میں اٹھائے گئے نقاط ہی اتنے قوی اور اتنے واضح ہیں کہ انکی صداقت کیلئے ہمیں روایات کے راویوں کی معتبریت کو دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی کیونکہ بیان کی گئی کہانی کسی بھی صورت حقیقت نہیں ہو سکتی بھلے کتنے ہی مضبوط راویوں کا سلسلہ کیوں نہ ہو۔لیکن پھر بھی عیسائی مشنریز اور ملحدین کے پیش کردہ وساوس کے لیے لیے گئے اس آخری تنکے کے سہارے کو ختم کرنے کے لیے ہم نے ابن حجر رحمہ اللہ کے موقف کا بھی تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔

اس قصے کی استنادی حالت کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کی تمام روایات میں یا تو ضعیف راوی ہیں ، یا راوی ثقہ ہیں ، لیکن سلسلہ سند متصل نہیں .. گویا محدثین نے کسی روایت کے صحیح ہونے کے لیے جو پانچ شروط مقرر کی ہیں ، وہ یہاں مفقود ہیں . یہی وجہ ہے کہ تمام جید علماء و مفسرین نے اس قصہ اس قصے کا علمی محاکمہ اور رد کیا ہے۔مثلا اِبو بکر محمد بن عبد اللہ بن محمد المعروف بابن العربي توفی سنة "542"، فی تفسیرہ "اِحکام القرآن". 2- القاضی عیاض بن موسی بن عیاض "544" فی کتابہ "الشفا فی حقوق المصطفیٰ". 3- فخر الدین محمد بن عمر بن الحسن الرازی "606" فی تفسیرہ "مفاتیح الغیب: 197-193/6" وقد مضی بعض کلامہ فی ذلک. 4- محمد بن اِحمد الاَنصاری اِبو عبد اللہ القرطبّی فی "اِحکام القرآن: 84-80/12". 5- محمد بن یوسف بن علی الکرمانی من شرّاح "البخاری: 786"، وقد نقل کلامہ فی ذلک الحافظ فی "الفتح: 498/8". 6- محمود بن اِحمد بدر الدین العینی "855" فی "عمدۃ القاری: 47/9". 7- محمد بن علی بن محمد الیمنی الشوکانی "1250" فی "فتح القدیر: 248-247/3". 8- السید محمود اِبو الفضل شہاب الدین الاَلوسی "1270" فی "روح المعانی: 169-160/17". - صدیق حسن خان اِبو الطیب "1307" فی تفسیرہ "فتح البیان". 10- محمد عبدہ المصری الاَستاذ الاِمام "1323" فی رسالۃ خاصۃ لہ فی ہذہ القصۃ.

استفادہ کتاب: " نصب المجانیق لنسف قصۃ الغرانیق " از علامہ ناصر الدین البانیؒ , تحقیقی جائزہ : محمد ابراھیم

قرآن، سابقہ الہامی کتابیں اور مستشرقین

تورات،زبور،انجیل اور قرآنِ مجید چاروں الہامی وآسمانی کتابیں ہیں۔خالقِ کائنات نے انہیں مختلف عہود میں اپنے جلیل القدر اور عظیم المرتبت پیغمبروں،حضرت موسیٰ علیہ السلام،حضرت داؤدعلیہ السلام،حضرت عیسیٰ علیہ السلام اورامام الانبیاءحضرت محمد المصطفٰےصلی اللہ علیہ وسلم پر بالترتیب نازل فرمائیں۔ان کے علاوہ بھی بہت سارے صحیفے اور کتابیں مختلف اوقات میں دیگر نبیوں اور رسولوں پر اترے اور ان کی تصدیق کرنا اور برحق سمجھنا فی الجملہ واجب ہےان کی آمد کا اوّلین مقصد بنی نوع انسان کی فلاح وبہبود،رشدوہدایت اور مالک الملک سے تعلق کی استواری،دین اوردنیا میں طریق حق اورراہِ نجات کی راہنمائی,ان پر عامل کیلئے دنیوی و اُخروی نعمتوں کی فراوانی کی بشارتیں اور اس کے برعکس پر سخت عذابِ الٰہی کی وعید تھا۔

آنحضرت ﷺ سے پہلے جس قدر انبیا آئے، ان کا دائرہ ارشاد و تبلیغ کسی خاص قوم یا اُمت ہی تک محدود تھا ، انکی تعلیمات کتابیں صحیفے مخصوص دور کے لیے تھی اس لیے وہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ختم ہوتی گئیں ، لیکن حضرت محمد ﷺ چونکہ آخری نبی تھے اس لیے آپ کو دی گئی کتاب قیامت تک کے انسانوں کے لیے تھیں اس لیے ان کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ نے خود اٹھائی اور یہ قیامت تک محفوظ رہیں۔یہود و نصاری نے اس بات کو قبول کرنے نہیں کرتے ، اس لیے یہودحضرت موسیٰ علیہ السلام کے ماسوا دیگر دونوں نبیوں حضرت عیسی اور محمد ﷺ کی نبوت کے انکاری ہیں۔اورعیسائی قوم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآنِ مجید کو الہامی کتاب تسلیم کرنے سے باغی ہیں۔

یہود بنی اسرائیل میں نبی کے آنے کے انتظار میں تھے لیکن اسکے بجائے بنی اسماعیل میں آجانے پر مخالفت پر اتر آئے ، چنانچہ حضور ﷺ جب مدینہ آئے تو آپ ﷺ کو یہود کی طرف سے سخت مخالف کا سامنا کرنا پڑا، حضور ﷺ کے انکے ساتھ بہترین برتاو ، برابر کے شہری کے حقوق دینے کے باوجود انہوں نے ﷺ کو تکلیف دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا، طرح طرح کے پراپیگنڈے، القابات، پھر قتل کی سازشیں جسکی وجہ سے بالاخر انکے اک قبیلے کا مدینہ سے نکالا جانا، پھر اس قبیلے کا تمام عرب کے مشرکین کو جمع کرکے جنگ احزاب کی شکل میں مدینے پر چڑھائی کروانا اور پھر مدینہ کے اندر کے یہود کو ساتھ ملا مسلمانوں کو درمیان میں پیس کرختم کرنے کی آخری کوشش کرنا۔ خلاصہ یہ کہ یہود نے پہلے دن سے اہل اسلام کو زک پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔اسی طرح عیسائیوں نے بھی آپ ﷺ کی نبوت کو قبول نہیں کیا اور وہ شروع سے مسلمانوں کی مخالف میں پیش پیش رہے ، حضور ﷺ کے ساتھ انکے مناظرے ہوے جنکا قرآن میں ذکر ہے۔بعد میں صلیبی جنگیں ، تحریک استشراق ۔۔ یہ مخالفت کا سلسلہ چودہ سو سال سے آج تک قائم ہے۔

قرآن پر استشراقی اعتراضات میں سر فہرست یہ اعتراض رہا ہے کہ "قرآن اللہ کا کلام نہیں بلکہ محمد ﷺ کا کلام ہے جسے انھوں نے اللہ کی طرف منسوب کر رکھا ہے"۔اسکی دلیل یہ دی گئی کہ قرآن پاک کا ایک معتد بہ حصہ اخبارامم ماضیہ، تاریخی وقائع اور انبیاء سابقین کے تذکروں پر مشتمل ہے ، یہ سب محمد ﷺ نے یہود ونصاری اور باقی مذاہب و قبائل کے لوگوں سے لے کر قرآن میں شامل کیا ہے۔

ہم اعجاز قرآن کے سلسلے میں اس پر تفصیل پیش کرچکے ہیں کہ قرآن مجید کا کلام معجزپکار پکار کر چیلنج دے رہا ہے کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا، اسکا انداز و اسلوب حیرت انگیز، اسکی زبان عاجز کردینے والی ، اسکی معلومات حیران کن ، اسکی پیشن گوئیاں ساری سچی، اسکی تعلیمات لافانی، اسکاماضی ، حال اور مستقبل کے متعلق بیان انتہائی مضبوط ، جھوٹ ، اختلافات اور غلطیوں سے پاک ۔۔یہ سب کمالات جن کو آج تک کوئی انسان جھٹلا نہیں سکا ، اس جیسی کتاب کی کوئی مثال پیش نہیں کرسکا، یہی باتیں کافی ہیں کہ اس پر انسانی کلام ہونے کی تہمت نا لگائی جاتی۔جب مخالفین و متعصبین ان باتوں کو جھٹلا نا سکے تو انہوں نے دوسرے رخ سے قرآن پر حملہ کیا .

قران مجید نے امم سابقہ اور انبیائے سلف کے واقعات کو بیان کیا ہے مثلاً جناب آدم جناب نوح، جناب ابراہیم، جناب یعقوب، جناب یوسف، جناب موسیٰ، جناب ہارون، جناب داود، جناب سلیمان، جناب عیسی اسی طرح دیگر انبیاء اور انکی امتوں کے حالات و واقعات کا تذکرہ قران مجید میں موجود ہے حالانکہ جناب سالتماب صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شخص سے تاریخی درس حاصل نہیں کیا اور چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا میں کبھی کوئی تعلیم حاصل نہیں کی تھی لہٰذا کسی تاریخی کتاب کا مطالعہ بھی ممکن نہ تھا۔نیز ان واقعات میں بہت سے واقعات ایسے بھی ہیں جن پر اس زمانہ

میں بالکل پردہ پڑا ہوا تھا اور ان کے معلوم کرنے کا حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے کوئی ذریعہ ممکن ہی نہ تھا لہٰذا بجائے اسکے اور کوئی صورت نہیں کہ آپ کی معلومات کا ذریعہ صرف وحی اور تعلیم ربانی ہو اور اسی کا نام معجزہ ہے اور یہی دلیل نبوت ہے۔

مستشرقین کی نظر سے شام کے تجارتی اسفار کاواقعہ گزرا، توپھران کے لیے ان واقعات کے لیے راہبوں کو حضور ﷺ کا معلم ثابت کرنے میں کوئی کلام نہیں رہ گیا۔ لیکن دقت یہ تھی کہ مختصروقت کی ملاقات تعلیم وتعلم کے لیے کافی نہیں۔ لہٰذااس قسم کے معلّمین کوعرب میں تلاش کیاگیا۔ مستشرقین کی نظرورقہ بن نوفل پرپڑی۔ بڑے وثوق سے کہاگیاکہ یہی آپ کی تعلیم پرمامور ہوئے۔ احناف عرب زید بن عمرو وغیرہ کے اقوال کو پیش کیا گیا، ان لوگوں کا معلمین ہونامستشرقین نے ناکافی سمجھاتوان اہل کتاب عالموں کو بھی اس فہرست میں شامل کردیا، جومکہ کے قرب وجوار میں رہتے تھے۔

اس سلسلے میں مستشرق ٹسڈل کی کتاب' دی اوریجنل سورس آف قرآن 'ملحدین میں کافی مشہور ہے ، گزشتہ چند ہفتوں سے یہی کتاب ہمارے پیج پر بھی زیر بحث ہے اور اس کتاب کے تقریباتمام بڑے مفروضوں کا ہم جواب دے چکے ہیں ان میں قبل از اسلام عرب میں توحید/حنیفیت (اس میں احناف عرب زید بن عمرو بن نفیل، ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبدالعزی بن قصی القرشی، لبیدبن ربیعۃ بن مالک ابو عقیل العامری کے توحید اقوال کی وجوہات پر تفصیلی بحث کی گئی) ، اسلام پر زرتشت مذہب ماخوذ ہونے کے الزام کی حقیقت ، قرآن کے عرب شعراء امیہ بن الصلت، امراؤ القیس وغیرہ کے کلام سے ماخوذ ہونے کا الزام، قصہ غرانیق وغیرہ پر معقول و مدلل انداز میں تفصیل پیش کی جاچکی ہے۔ اگلی تحاریر میں ملحدین کے پیش کردہ ٹسڈل کے اس اعتراض کہ قرآن پرانی کتابوں سے ماخوذ ہے ' کا تحقیقی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

مستشرقین کی طرف سے یہ الزام لگایا کہ آپ نے قرآن مجید انجیل ،تورات اور اہل کتاب کی روایات سے اخذ کیا ہے۔ ان پرانی آسمانی کتابوں کے معلّمین میں مختلف لوگوں کے نام لیے گئے جن میں شام کا بحیرہ راہب، ورقہ بن نوفل ، مدینہ کے یہودی کہ حضور ﷺ انکے شاگرد تھے۔ ایک مستشرق 'فلیپ ایرلنگی' نے اپنے ایک مضمون میں لکھا:

"محمد کی مکہ میں اکثریہودیوں سے ملاقات ہوتی رہتی تھیں... محمد اپنے خادم زید سے جو عیسائیوں کاغلام رہ چکاتھا یہودیوں اور مسیحی مذاہب کے بارے میں استفادہ کی غرض سے سوالات کیاکرتے تھے وہ اپنے خادم سے زیادہ سمجھ دار تھے... مدینہ میں محمد یہودیوں کے شاگردرہے ، یہودیوں ہی نے آپ کی شخصیت سازی کی تھی یہودیوں اور مسیحیوں میں جو داستانیں مشہور تھیں جبرئیل ان سب کو محمد کے سامنے بیان کردیا کرتے تھے۔"

(ڈاکٹر التہامی نقرہ، مستشرقین اور قرآن، (عربی اسلامی علوم اور مستشرقین (مجموعہ مقالات عربی) مترجم: ڈاکٹر محمد ثناء اللہ ندوی) توحید ایجوکیشنل ٹرسٹ، کشن گنج، بہار، ۲۰۰۴ء، ص: ۱۲،)

بحیرہ راہب کی نسبت سے کیے گئے اعتراض کے جواب میں ہم سیرت النبی کے سلسلے میں تفصیلی تحقیق پیش کرچکے ہیں۔ مستشرقین نے لکھا ہے کہ قرآن کااصل مصنف بحیراہے جس سے حضورنے اخذکیاہے۔ عیسائی مشن کے اس اعترض میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے بہت کچھ ظاہر فریبی سے کام لیا ہے اور مغالطہ پر حقیقت کا پالش کرنا چاہا ہے۔ لیکن ایک ادنٰی غور وتامل کے کے بعد اس ملمع گری کی قلعی کھل جاتی ہے۔ اس ذہنی خرافات کے متعلق دو باتیں پیش ہیں۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ لکھتے ہیں:

"کیایہ معجزہ رونماہوسکتاہے کہ نوسال کی عمرکاایک بچہ قرآن پاک کی ۱۱۴/سورتیں چندمنٹ میں حفظ کرلے اورپھرایک نسل کے بعدان قرآنی سورتوں کو یہ کہہ کراپنی امت کے روبروپیش کرے کہ یہ اللہ کاکلام ہے ؟۔" (ڈاکٹر محمد حمیداللہ، محمد رسول اللہ، فرید بک ڈپو، دہلی، ۲۰۰۳ء، ص: ۱۴-۱۵)

علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"ہمارے عیسائی احباب اس ضعیف روایت پر اپنے شکوک وشبہات کی عظیم الشان عمارت قائم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پیغمبراسلام نے اسی راہب کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ اگر یہ صحیح ہے تو دنیاکے لیے اس سے بڑا معجزہ محمد رسول اللہ کا اور کیا چاہیے کہ ایک ابجد ناآشنا طفل دوازدہ سالہ نے چند

گھنٹوں میں حقائق واسرار دین،اصول عقائد ،نکات اخلاق، مہمات قانون اور ایک شریعت عظمی کی تکمیل وتاسیس کے طریقے سب کچھ سیکھ لیے۔کیا ہمارے عیسائی دوست اس معجزہ کو تسلیم کرتے ہیں۔"(سیرۃ النبی،ج:۳،ص:۳۶۲)

دوسری بات مدینہ کے یہود کا حضورﷺ کو اپنی شاگردی میں لینا ایک ایسا مضحکہ خیز جھوٹ ہے جس پر دوسری جگہ مستشرقین خود بھی یقین نہیں کرتے۔کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ایک طرف تو یہود و نصاری حضور ﷺ کی نبوت کو ہی تسلیم نہیں کررہے اور اول دن سے دشمنی نبارہے ہیں ، دوسری طرف حضورﷺ کو اپنی کتابوں کی تعلیم بھی دے رہے ہیں ؟ آپ ﷺ کی شخصیت سازی بھی کررہے ہیں ؟ ناصرف بائبل بلکہ اپنے تمام قدیم صحیفے، کتابیں لا کے حضور ﷺ کے سامنے رکھ دی ہیں ، جن کو ناصرف حضور ﷺ قرآن میں کاپی کرتے جارہے ہیں بلکہ انکی بالکل تصحیح بھی کرتے جارہے ہیں اور یہ سب کام وہ اتنے رازدارانہ انداز میں ہورہا ہے کہ مشرکین مکہ اور باقی مخالفین کو بالکل خبر ہی نہیں ہورہی۔۔۔!

دیکھا جائے تو قرآن نے جہاں مشرکین عرب کی مخالفت کا علم بلند کیا وہاں قرآن کا ایک مورچہ اہل کتاب کے مقابل بھی لگا ہوا تھا۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو کیا کوئی معمولی عقل کا شخص بھی یہ کب گوارا کرسکتا تھا کہ اسی گروہ کی پڑھائی ہوئی مشہور عام باتوں کو خود اسی مجمع کے سامنے وحی الٰہی بتلا کر پیش کرے۔عیسائیوں کے دماغ میں یہ بات سما سکتی ہو لیکن دنیا کو کوئی عاقل تو اسکو ایک سیکنڈ کے لئے بھی تسلیم نہیں کر سکتا۔اور اگر بالفرض ایسی فاحش غلطی ہو بھی جائے تو اس میں کامیابی کہاں تک ہو سکتی تھی۔مکہ مدینہ کے یہود و نصاریٰ کب خاموش رہ سکتے تھے۔

عیسائی مشن کا یہ اعتراض پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نہیں بلکہ اپنے بزرگوں کی سادہ لوحی اور بھولے پن پر ہے۔۔!!

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہود و نصاریٰ مکہ و مدینہ کی زبان سے جو کُچھ سنی سنائی سابقین کے تاریخی واقعات معلوم ہوسکتے تھے وہ کوئی مخفی واقعات نہیں ہو سکتے تھے۔عام اشاعت ہی کی جہت سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک ان کا پہنچنا ممکن تھا جن کا علم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے آپ کی ساری قوم کو ہونا چاہئے تھا۔یہ چیزیں ہر گز ایسی نہ تھیں جنکو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی مخصوص معلومات کے طور پر خود اپنی قوم کے اندر جوان معلومات میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوش بدوش اور برابر شریک تھے پیش کرسکیں۔اگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے مقام سے ہٹکر کسی دوسرے دوردراز مقام پر دعویٰ نبوت کیا ہوتا تو البتہ اس شبہ کے لئے کوئی امکان پیدا ہو سکتا تھا۔

ورقہ بن نوفل :

ورقہ کا نام تاریخ اسلام میں صرف ایک مقام پر پایا جاتا ہے وہ اس وقت کہ جب فرشتہ کے نازل ہونے کا واقعہ آپ ﷺ نے اپنی زوجہ خدیجہ بن خویلد سے بیان کیا اور انہوں نے ورقہ بن نوفل سے اس کا ذکر کیا اور ورقہ نے یہ بتلایا کہ ضرور یہ شخص وہی نبی ہے جس کی خبر ہماری کتابوں میں دی گئی ہے۔اس واقعہ کے علاوہ اسلامی تاریخ میں اور کہیں ورقہ کا نام نہیں پایا جاتا۔اس واقعہ میں بھی بذات خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ورقہ سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معلومات کا ورقہ بن نوفل کے علم سے کسی طرح کا تعلق نہ ہونا اسکی نہایت زبردست اور روشن شہادت خدیجہ بن خویلد کا ایمان ہے جنہوں نے مذکورہ بالا تاریخی واقعہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے میں سبقت کی اور بعثت کے بعد فوراً ہی اپنے ایمان کا اظہار کیا۔اپنا تمام مال و اثاثہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و رسالت پر قربان کردیا۔ایمان لانیکے بعد جناب خدیجہ کو ایک دن آرام چین کی زندگی نصیب نہ ہوئی اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح مکہ کی زمین آپ کے لئے بھی تنگ ہو گئی۔لیکن مرتے دم تک مصایب کا نشانہ بنکر اپنے ثبات و استقلال کا قابل تقلید نمونہ پیش کرتی رہیں۔کفار مکہ سے آئے دن جو اذیتیں پہنچتی رہتی تھیں اسمیں اپنے مظلوم شوہر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی ہمیشہ تسلی و دلاسا دیتی رہتی تھیں۔جو ان کے صادق العقیدہ اور راسخ الایمان ہونیکی روشن دلیل ہے جس سال اس رفیق زندگی نے وفات پائی اس سال کا نام پیغمبر اسلام نے عام الحزن رکھا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی زندگی کے آخری لمحواں تک اس محسنہ اسلام زوجہ کے استقلال و ثبات قدم اور رسوخ ایمان کی داد دیتے رہے۔بلا شبہ مصیبت و آفت کے پر آشوب دور میں جناب خدیجہ کی مبارک سیرت کی یہ اعلیٰ مثال پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و رسالت کی پوری مصدق ور آپ کی صداقت پر تیز روشنی ڈالتی ہے۔

یہ امر بالکل واضح ہے کہ اگر پیغمبر اسلام کے معلومات کا کُچھ بھی تعلق ورقہ سے ہوتا اور ورقہ کے علمی فیوض کو آپ نے دنیا کے سامنے سرمایہ نبوت بنا کر پیش کیا ہوتا تو خدیجہ کے دل میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشن کی ہرگز یہ قدر و عزت قایم نہیں ہو سکتی تھی۔ان کے قدم میں یہ استقلال کبھی نہ پیدا ہوتا اور اس مصنوعی اور فرضی نبوت کے لئے جناب خدیجہ ہرگز اس قدر مالی اور جانی قربانیاں نہیں پیش کرسکتی تھیں۔نیز یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جس کا علم جناب خدیجہ تک محدود رہ جاتا۔آپ کی قوم سے جو آپ کی ہر حرکت و سکون کی پوری نگراں تھی اس راز کا محفوظ رہنا اور فاش نہ ہونا بالکل ناممکن تھا۔

مزید جب نبیؐ کریم پہلی وحی کے نزول کے بعد ورقہ بن نوفل سے ملنے گئے۔اس واقعے کے تین سال بعد ورقہ کا انتقال ہوگیا۔جبکہ آیات تقریباً 23 برس تک حالات و واقعات کے مطابق نازل ہوتی رہیں ، علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آنخضرت کی پیغمبرانہ زندگی پورے ۲۳/برس تک قائم رہی ،اگرآں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی انسانی معلم سے فیض پاتے رہتے تو ضرور تھاکہ وہ اس پورے زمانہ تک یابڑی حدتک خلوت وجلوت میں آپ کے ساتھ رہتاکہ وقت ضرورت (نعوذباللہ)آپ اس سے قرآن بنواتے ،احکام ومواعظ سیکھتے، اسرارونکات معلوم کرتے اوریہ شخص یقینا مسلمان نہ ہوتا،کیوں کہ جو شخص خودمدعی نبوت کو تعلیم دے رہاہو،وہ کیوں کراس کی نبوت کوتسلیم کرسکتاتھااور پھراس شہرت عام، ذکرجمیل، رفعت مقام کو دیکھ کرجومدعی نبوت کوحاصل ہورہی تھی ،وہ خودپردہ کے پیچھے گم نامی پسند کرتااورصحابہ کرام کی نگاہوں سے اس کا وجودہمیشہ مستور رہتا،جس عجمی کی نسبت قریش کو شبہ تھا،اگرحقیقت میں آپ اس سے تعلیم حاصل کیا کرتے توقریش جوآپ کی تکذیب ،تذلیل اورآپ کوخاموش کرنے کی تدبیرپر عمل پیراہورہے تھے ،ان کے لیے آسان تھاکہ اس غلام عجمی کوالگ کردیتے کہ محمدرسول اللہ کا وحی اورقرآن کاتمام کاروبار دفعتاًدرہم برہم ہوجاتا، علاوہ ازیں زیادہ سے زیادہ اس کاوجودمکہ میں تھا،پھرمدینہ میں ۱۳/برس تک سینۂ نبوت سے فیضان الٰہی کاسرچشمہ کیوں کر ابلتا رہا،قرآن شریعت اسلام اوراحکام کابڑاحصہ یہیں وحی ہواہے ،مکہ میں تونسبتاًبہت کم سورتیں نازل ہوئیں۔"(سیرۃ النبی،ج:۳،ص:۳۶۲)

رسول کریم (ﷺ) کے دشمن اپنا یہ دعوی ثابت کرنے کے لیےمسلسل ٹوہ میں لگے رہتے تھے۔کہ نبیؐ کریم ﷺ (نعوذ باللہ) جھوٹے ہیں لیکن وہ اس بات کے حق میں ایک بھی مثال پیش نہ کرسکے کہ کبھی آپ نے مخصوص یہودیوں اور عیسائیوں سے کوئی خفیہ ملاقات کی ہو۔قریش کے انتہائی ممتاز سردار جنہوں نے رسول اللہ (ﷺ) کی پیروی کی اور اسلام قبول کیا، اتنے ذہین اور دانشمند تھے کہ جس ذریعے سے پیغمبر ان کے پاس وحی لے کر آتے تھے اس کے متعلق اگر وہ کوئی بات مشکوک پاتے تو بآسانی بھانپ سکتے تھے۔ پھر یہ کوئی مختصر وقت کی بات نہیں تھی، نبی (ﷺ) کی دعوت اور تحریک 23 برس تک جاری رہی ، اس دوران میں کبھی کسی کو اس طرح کا شک نہ گذرا۔پھر یہ بات بھی ناقابل تصور ہے کہ کوئی شخص ایسی صورت حال قبول کرسکتا ہے کہ وہ قرآن وضع کرے لیکن اس کا کوئی کریڈٹ بھی نہ لے، لہٰذا تاریخی اور منطقی طور پر یہ دعویٰ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن کا کوئی انسانی ماخذ تھا۔

قرآن اور تورات و انجیل کے قصے

ملحد ٹسڈل کی کتاب سے تفصیل پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے :

"مسلمان کہتے ہیں کہ قرآن میں سابقہ صحائف سماوی کی باتوں کا وارد ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں، کیوں کہ ان کا خدا ایک ہی ہے اس لیے ان قصوں کا شامل ہونا اس امر پر مہرصداقت ثبت کرتا ہے کہ قرآن بھی آسمانی کتاب ہے۔اس دعوے کی قلعی یوں کھل جاتی ہے کہ قرآن کو شاید خود ہی یہ پتہ نہیں کہ اس میں درج بیشتر قصے اور کہانیاں پہلے پیغمبروں کی کتابوں (توریت اور انجیل) میں نہیں بلکہ ان کتابوں کے مفسرین اور ان کے امتیوں کی جمع کردہ احادیث کی کتابوں میں مرقوم ہیں۔۔۔قرآن نے افسانوں اور خرافات سے بھرے عہد نامہ قدیم و جدید کی ہی تصدیق نہیں کی بلکہ تالمود اور مدراش کی بھی تصدیق کی جو خرافات کی سب سے بڑی فیکٹریاں ہیں تالمود مشنات اور جمارا پر مشتمل ہے۔"

تبصرہ :

یہاں دو باتیں تفصیل طلب ہیں۔

1- قرآن نے انبیاء سابقہ اور انکی اقوام کے متعلق جو تفصیلات پیش کی کیا وہ بعینی تورات و انجیل کا بیان ہیں ؟ قرآن و تورات کے بیان میں کتنی مماثلت ہے اور کس کا بیان منطقی و تاریخی لحاظ سے درست ہے ؟کیا قرآن میں تاریخی وقائع اور انبیاء سابقین کے متعلق اسکے علاوہ کچھ بھی نہیں پیش کیا گیا جو تورات انجیل اور پرانے صحیفوں کے ذریعے یہود و نصاری تک پہنچا؟

2- وہ تفاصیل جنکا ذکر تورات و انجیل میں نہیں ہے بلکہ انکی دوسرے درجے کی کتابوں میں ہے ' کیا وہ سب خرافات سے بھرپور ہیں ؟ کیا علمائے یہود ان سب کو خرافات کہتے ہیں ؟ اگر وہ تفاصیل برحق ہیں تو انکا ذکر تورات و انجیل میں کیوں نہیں آیا ؟ انکا ذکر یہود کی دوسرے درجے کی کتابوں میں کیسے آیا ہے ؟ کیا قرآن نے جہاں ان واقعات پر تفصیل پیش کی ہے کیا وہ بھی اسی طرح کی خرافات پر مشتمل ہے ؟

قرآن اور سابقہ آسمانی کتابیں :

1. کیا قرآن اور پرانی کتابوں کے بیان میں کوئی فرق نہیں ؟

قرآن اور پرانی کتابوں میں مصدر اور خدائی پیغام ایک ہی ہے لیکن اس کے باوجود قدیم آسمانی کتب میں جا بجا تحریفات ہیں. چند نکات پیش :

۱) مصدر اور خدائی پیغام ایک ہی ہے لہٰذا واقعات کا ایک جیسا نا ہونا زیادہ اچھنبے کی بات ہے بجائے واقعات کے ایک جیسا ہونے کے.

۲) مصدر کے ایک ہونے کے باوجود واقعات میں مکمل طور پر یکسانیت نہیں ہے بلکہ پڑھنے والا صاف محسوس کر سکتا ہے کہ قرآن تناقصات، تضادات ، سائنسی غلطیوں اور ہر طرح کی بیہودگیوں سے بالکل پاک ہے. کیا قرآن میں پرانی روایتی کہانیوں ، فرضی قصوں اور مشرکانہ توہم پرستی نظر آتی ہے جو چیخ چیخ کر یہ اعلان کرتی ہے کہ یہ خدا کا کلام نہیں بلکہ انسانی تصّور و وہم کا نتیجہ ہے؟

۳) قرآن دوسری کتابوں کے برعکس توحید کے بنیادی تصور کو اپنی تمام تر اعلیٰ و ارفع حیثیت سے ، تناقصات اور تضادات سے پاک کرتے ہوے سختی سے راسخ کرتا نظر آتا ہے اور تمام مخلوقات اور خالق میں ایک واضح فرق کرتا نظر آتا ہے، لیکن باقی کتابوں کا حال اس کے برعکس ہے ، چند مثالیں ملاحظہ کیجیے۔

خدا اور جیکوب کے درمیان کشتی کے ایک انوکھے مقابلے کا احوال ہے جس میں جیکوب خدا کو عاجز کر دیتا ہے.اور خدا اپنی تمام قدرت ، الوہیت اور طاقت کے ایک فانی انسان کو جسمانی طور پر شکست نہیں دے پاتا. پیدائش (۳۲ : ۲۴-۲۸)

کیا آپکو قرآن میں اس طرح کے بیہودہ اور واہیات کہانیاں پڑھنے کو ملتی ہیں؟

"خداوند زمین پر انسان کو پیدا کرنے سے ملول ہوا اور دل میں غم کیا " " خداوند ساؤل کو بنی اسرائیل کا بادشاہ کر کے ملول ہوا " کیونکہ وہ اسکی پیروی سے پھر گیا تھا "(پیدائش ۶ : ۱-۶ / سموئیل ۱۵ : ۱۱،۳۵)

اسی طرح جب بنی آدم بابل میں ایک برج بنانے لگے " جسکی چوٹی آسمان تک بلند ہونی تھی " تو خداوند اسے " دیکھنے کو اترا "

" خداوند یہوداہ کے ساتھ تھا سو اس نے کوہستانیوں کو نکال دیا پر وادی کے باشندوں کو نا نکال سکا کیونکہ انکے پاس لوہے کے رتھ تھے " (قضاہ ۱ : ۱۹)

" تب میں نے کہ افسوس اے خداوند ، تو نے ان لوگوں کو اور یروشلم یہ کہ کر دغا دی کہ تم سلامت رہو گے ، حالانکہ تلوار جن تک پہنچ گئی " (یرمیاہ ، ۴ : ۱۰)

"خدا نے پچاس ہزار اور ستر آدمی صرف اس لئے مار ڈالے کہ انہوں نے خداوند کے صندوق کے اندر جھانکا تھا " (سموئیل ۶ : ۱۹)

ایک اور مقام پر کہا گیا ہے کہ وہ باپ دادا کے گناہ کی سزا انکے بیٹوں اور پوتوں کو تیسری اور چوتھی پشت تک دیتا ہے . (خروج ۳۴ : ۶-۷)

بائبل کے مطابق خدا نے یعقوب کی محبت میں " عیسو سے عداوت رکھی اسکے پہاڑوں کو ویران کیا اور اسکی میراث بیاباں کے گیدڑوں کو دے دی " (ملاکی ۱ : ۲-۳)

۵) کیا فاضل مضمون نگار کو انبیا علیھم صلواۃ السلام سے منسوب گھناؤنی ، بیہودہ اور انتہائی فحش داستانیں، (معاذ اللہ) قرآن مجید میں نظر آتی ہیں. حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن کریم نے تمام انبیا علیھم صلواۃ السلام کا درجہ اس طرح بلند کیا ہے کہ کسی ایک نبی کا انکار تمام انبیا کا انکار بن جاتا ہے نہ صرف انبیا بلکہ انکی کتابوں کا بھی انکار اسلام کے دائرے سے کسی کو بھی نکال پھینک سکتا ہے. کیا فاضل مضمون نگار عظمت انبیا کے خلاف کوئی ایسی چیز پاتے ہیں جو دوسری قدیم کتابوں میں ملتی ہے کہ جہاں معاشرے میں موجود ساری خرافات کو جائز ٹہرانے کے لئے انھیں انبیا سے منسوب کر دیا جاتا ہو ؟

" خدا بری روح ساؤل پر زور سے نازل کرتا ہے اور وہ غیر کے اندر نبوت (غیب بینی اور پشین گوئی) کرنے لگتا ہے. پھر ایک موقع پر یہی ساؤل ننگا ہو کر نبوت کرنے لگتا ہے. ایک اور نبی (غیب بین اور پیش گو) دوسرے نبی سے یہ کہ کر کہ میں بھی تیری طرح نبی ہوں . اسے خداوند کا جھوٹا کلام سناتا ہے اور دھوکہ دے کر مبتلائے معصیت و عذاب کر دیتا ہے.(سموئیل ۱۸: ۱۰/ ۱۹: ۲۴ اور سلاطین ۱۳ : ۲۶/۱۱)

" اس (نوح) نے شراب پی اور اسے نشہ آیا اور وہ اپنے ڈرے میں برہنہ ہو گیا . حتیٰ کہ انکے بیٹے حام نے انھیں اس حالت میں دیکھا. (پیدائش ۶ : ۹ ، ۹ : ۲۰-۲۲)

بائبل کے بیان کے مطابق ، لوط کی دو سگی بیٹیوں نے انھیں شراب پلائی اور پھر باری باری ان سے ہم آغوش ہوئیں (نعوذ باللہ) حتیٰ کے لوط کی یہ دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں اور ان سے ایک ایک بیٹا پیدا ہوا. جن میں ایک موآبیوں کا باپ اور دوسرا بنی عمون کا باپ تھا. (پیدائش ۱۹: ۳۰-۳۸)

ایک پورے باب (۲ سموئیل ۱۱) میں حضرت داؤد علیہ السلام سے ایک حیا سوز قصّہ منسوب کیا گیا ہے. جسکی تفصیلات نہایت گھناؤنی ہیں جنہیں نقل کرتے ہوئے بھی خوف آتا ہے. اس قصّہ میں داؤد نے اپنے محل کی چھت سے ایک عورت بت سبع کو نہاتے ہوئے دیکھا ، جو نہایت خوبصورت تھی . انہوں نے اسے بلا کر اس سے صحبت کی اور وہ حاملہ ہو گئی . اسکا شوہر اوریاہ محاذ جنگ پر تھا داؤد نے حامل پر پردہ ڈالنے کے لئے اسے بلا بھیجا . مگر وہ جنگ میں اتنا مصروف تھا کہ اس نے گھر آنا مناسب نا سمجھا. کوششوں کے باوجود جب وہ تیار نا ہوا تو اپنے سپہ سالار کی مدد سے اسکو مروا ڈالا اور پھر اسکی بیوہ کو اپنی بیوی بنا لیا.اسی بت سبع کو بائبل سلیمان کی ماں بھی قرار دیتی ہے.

" اور بادشاہ داؤد بوڑھا اور کہن سال ہوا اور وہ اسے کپڑے اوڑھاتے پر وہ گرم نا ہوتا تھا . سو اسکے خادموں نے کہا کہ اس کے لئے کنواری ڈھونڈی جائے جو بادشاہ کہ پہلو میں لیٹ جایا کرے تاکہ ہمارے بادشاہ کو گرمی پہنچے " چنانچہ اس تجویز پر عمل ہوا اور ساری مملکت میں سے تلاش کر کے خوبصورت لڑکیاں بادشاہ کی خدمات میں لائی گئیں.

(۱ سلاطین ۱ : ۱-۴)

" اور سلیمان بادشاہ فرعون کی بیٹی کے علاوہ بہت سی اجنبی قوموں کی عورتوں سے محبت کرنے لگا.... اور اسکی بیویوں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کرلیا اور اسکا دل خدا کے ساتھ کامل نا رہا جیسا کہ اسکے باپ داؤد کا دل تھا"

(ا سلاطین ۱۱ : ۱-۶)

سوال : اگر قرآن کریم کسی بھی کتاب کی نقل ہے تو یہ خرافات قرآن میں کیوں نقل نہیں ہوئیں ؟کیوں قرآن کریم قدیم کتابوں کے برعکس انبیاء کی عظمت اور ناموس کی نگہبانی کرتا ہے ؟

کتب سابقہ یہود دروغ قلم کی بدولت بدترین تحاریف سے دوچار ہوچکی ہیں جن کی وجہ سے جہاں یہ کتب خرافات مختلفہ سے مملو ہوچکی ہیں وہی یہ کتب عصمت انبیاء پر بھی انگلی اٹھانے سے نہیں چوکتی ہیں جبکہ قرآن کریم جو کہ عصمت انبیاء کا سب سے بڑا محافظ ہے وہ ان سب خرافات کو لغو قراردے کر قرآن کریم میں واقعہ کی درشگی اور اصل روح کے ساتھ دوبارہ بیان کرتا ہے جس سے ان جمیع الزامات کی انبیاء کرام علیہم السلام کی ذات عالیہ سے تردید ہوجاتی ہے جو یہودی روایات اور تورات کی رو سے انبیاء پر عائد ہوتے ہیں۔قرآن سےسابقہ انبیاء کی عصمت و عظمت کی چند مثالیں پیش ہیں۔

إِنَّ اللّٰه اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ(سورۃ آل عمران 32) بے شک اللہ نے چن لیا آدم ونوح اور آل ابراہیم اور آل عمران علیہم السلام کو تمام جہانوں پر۔

سَلَامٌ عَلَىٰ نُوحٍ فِي الْعَالَمِينَ(سورۃ الصافات79)نوح علیہ السلام پر تمام جہانوں میں سلام ہو۔

اسی طرح لوط علیہ السلام کی شان اقدس میں قرآن مجید فرماتا ہے۔

وَإِنَّ لُوطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِينَ(سورۃ الصافات133) اور بےشک لوط علیہ السلام رسولوں میں سے ہیں۔

وَإِسْمَاعِيلَ وَالْيَسَعَ وَيُونُسَ وَلُوطًا وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ(سورۃ الانعام86) اور اسماعیل والیسع اور یونس اور لوط علیہم السلام سب پر ہم نے جہانوں میں سے انعام کیا۔

دونوں کتب میں موجود بعدالمشرقین رکھنے والے اس فرق کے باوجود کوئی جاہل ہی قرآن مجید کو ان کتب کا مصدق کہے گا۔

کیا قرآن تورات کے علاوہ یہودی روایات پر مبنی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے؟

1. معترض نےبڑے دھڑلے سے یہ دعویٰ کیا کہ "قرآن مجید تورات کے علاوہ یہودی روایات پر مبنی کتاب تالمود کی کتاب کی بھی تصدیق کرتا ہے جو کہ دو حصوں مشنا اور گمارا بھی مشتمل ہے" حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید بہت سی یہودی روایات کی بھی تردید کرتا ہے اگرچہ یہ خود اپنی ذات میں ایک موضوع ہے مگر اختصارا ایک مثال ضرور پیش کرنا چاہوں گا۔

تالمود کی کتاب Kallah (1) (18b میں عیسیٰ علیہ السلام کو (نعوذباللہ منہ) ناجائز اولاد اور حیض کی دوران کی پیداوار کہا گیا ہے۔اسی طرح Sanhedrin, 67-a نامی کتاب میں بھی عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں بدترین گستاخی کی گئی ہے۔(بحوالہ Talmud Unmasked by I.B. Prainitis)

اب اگر قرآن مجید ان تالمودی خرافات کی تصدیق کرنے والا ہوتا تو عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ صدیقہ کی شان اقدس میں اتنی آیات مبارکہ اتار کر ان کی عصمت وپاکیزگی کی گواہی کیوں بیان کرتا؟حتیٰ کہ قرآن مجید میں کسی بھی عورت کا نام نہیں لیا گیا بلکہ ہر جگہ صرف امراۃ کہہ کر عورت کا ذکر کیا گیا لیکن مریم صدیقہ علیہاالسلام کی پاکیزگی بیان کرنے کے لئے اللہ نے پوری ایک سورۃ مریم ان کے نام سے اتار دی۔

إِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ(سورۃ آل عمران45)

اور جب فرشتوں نے کہا کہ اے مریم بےشک اللہ آپ کو خوشخبری دیتا ہے کلمہ کی جس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا اور وہ دنیا میں کامیاب اور آخرت میں مقربین میں سے ہونگے۔

إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ فَآمِنُوا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ(سورۃ النساء171)

بے شک مسیح عیسیٰ ابن مریم اللہ کے رسول ہیں اور کلمتہ ہیں جو اللہ نے مریم علیہاالسلام کی طرف بھیجا اور اللہ کی عطا کردہ روحوں میں سے روح ہیں پس اللہ او اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔

تالمودی الزامات کی اس صریح تردید کے باوجود قرآن مجید کو ہر تالمودی روایات سے متفق کہنا جہالت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

قرآن اور اسرائیلیات

ملحد امجد حسین نے سورہ الشعراء سے اپنی بات کا آغاز کرتے ہوئے قرآنِ کریم کے پچھلی کتابوں کے متعلق کیے گئے اِس دعویٰ کو اپنے اعتراض کی بنیاد بنایا ہے کہ قرآن وحی الٰہی کے باہم مربوط سلسلے کی حتمی شکل ہے، لہٰذا اِس کا پچھلی کتابوں سے گہرا تعلق ہے۔

ملحد امجد حسین کا دعویٰ ہے کہ قرآنِ کریم کا سابقہ کُتبِ سماوی سے گہرا تعلق نہیں ہے کیونکہ اکثر واقعات و حادثات جو قرآن نے پچھلی کتابوں سے منسوب کر کے بیان کیے ہیں، وہ یہودی اور مسیحی کتب میں موجود نہیں ہیں۔مزید برآں، اگر کوئی واقعات موجود بھی ہیں تو وہ ہو بہو رقم نہیں کیے جا سکے، بلکہ ردّوبدل کر دیئے گئے ہیں، جو کہ قرآن کی صحت پر سوالیہ نشان اُٹھاتا ہے۔جو قرآنی آیات اعتراض پیش کرنے کے لیے استعمال کی گئی ہیں، وہ سورہ الشعراء کی 192 سے 196 تک کی آیات ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: " یہ قرآن ربُ العالمین کا اتارا ہوا ہے۔اس کو امانت دار روح القدس لے کر اترے ہیں۔ جنھوں نے آپ کے دل پر اِس کو اُتار دیا، تاکہ آپ لوگوں کو خبردار کرتے رہیں۔ (یہ قرآن) روشن عربی زبان میں ہے۔بے شک اِن باتوں کی خبر پہلے نازل شدہ صحائف میں موجود ہے۔"

ملحد امجد حسین کے اعتراض کے رد میں زیادہ مشقت کی ضرورت اِس لیے بھی نہیں ہے، کیونکہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ امجد حسین محض اپنی سوچ کی کسوٹی پر کچھ "مفروضے" قائم کر رہا ہے، جن کا معروضی تاریخ اور سامی مذہبی فکر سے بنیادی طور پر کوئی تعلق نہیں۔امجد حسین نے اگرچہ مستشرق ٹسڈل کی کتاب سے قرآن پر کی گئی کڑی تنقید نقل کی ہے اور قرآن کے مُبیّنہ زمینی مآخذوں کا ذکر کیا ہے، تاہم اِس کے ساتھ ساتھ اُس نے اپنے ذہن کا زہر بھی اِس کے اندر ڈال دیا ہے۔لیکن اِس سب کے باوجود بات محض ایک دعویٰ سے آگے نہیں بڑھ سکی اور بُغض وعناد کی شکل اختیار کر گئی ہے۔

ملحد امجد حسین کا کہنا ہے کہ وہ سبھی واقعات سابقہ کُتبِ سماوی میں موجود نہیں ہیں، جو قرآن میں مذکور ہیں۔اُس کے اِس دعویٰ کی بنیاد موجودہ "بائبل مقدس" ہے، جس کی 66 یا 73 کُتب کو وہ سورہ الشعراء کی آیت 196 میں بیان کردہ "زُبُر الاوّلین" کے مساوی شمار کر کے اپنا یہ اعتراض داغ رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ سبھی واقعات تو اُن کُتب میں موجود ہی نہیں ہیں، لہٰذا بقول امجد حسین: "اس دعوے کی قلعی یوں کھل جاتی ہے کہ قرآن کو شاید خود ہی یہ پتہ نہیں کہ اس میں درج بیشتر قصے اور کہانیاں پہلے پیغمبروں کی کتابوں (توریت اور انجیل) میں نہیں بلکہ ان کتابوں کے مفسرین اور ان کے امتیوں کی جمع کردہ احادیث کی کتابوں میں مرقوم ہیں۔"

پہلی بات تو یہ ہے کہ ملحد امجد حسین کے پاس ایسی کوئی سند نہیں ہے جس سے ثابت ہو کہ قرآنِ کریم نے کتبِ سابقہ کے ذکر میں اِنہی چند ایک کُتب کو سامنے رکھا ہے، جو ملحد معترض فرض کیے بیٹھا ہے۔دوسری بات یہ کہ خود آلِ یہود الہام کے ارتقاء پر یقین رکھتے ہیں اور یہ تسلیم کرتے ہیں کہ طبقۂ احبار (Levites) کے زیرِ انتظام توریت کی تفسیر بھی الہامی معیار ہی رکھتی ہے، کیونکہ بنی اسرائیل کے اکثر انبیاء کا تعلق اِسی طبقہ سے تھا اور تفسیر کا یہ شعبہ بائبل کے مطابق خود موسیٰؑ سے یُوشع بن نونؑ کی طرف منتقل ہوا۔توریت کی پانچویں کتاب، "کتابِ استثناء"، کے باب 34 میں تحریر شدہ حضرت موسیٰؑ کی وفات کا واقعہ اور اُس پر تبصرہ جنابِ یُوشعؑ کی ہی طرف منسوب ہے۔اگرچہ تفسیری کُتب کا معیار یہودیوں کے ہاں توریت سے نیچے ہے، تاہم اِس کے الہامی مرتبہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔اِس کے برعکس یہودی دوسری طرف مسیحی صحائف کو "الہامی" ماننے کو تیار نہیں ہیں، بلکہ مسیحیت کو "بدعتی فرقہ" قرار دیتے ہوئے اِس کے صحائف کو گمراہی سے تشبیہ دیتے ہیں۔اُن کے نزدیک جنابِ عیسیٰؑ مسیحِ موعود نہیں تھے، اِس لیے کسی نئے خدائی عہد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔البتہ دوسری جانب مسیحی دُنیا اِس بات کی پُرزور داعی ہے کہ "عہد نامہ جدید" (New Testament) نہ صرف الہامی ہے، بلکہ بائبل کا جزوِ لازم ہے اور یہودی "عہد نامہ قدیم" (Old Testament) پر فوقیت رکھتا ہے۔اتنے بڑے دعوے کے باوجود حیران کُن امر یہ ہے کہ مسیحی دُنیا آج تک بائبل کے اندر موجود کُتب کی تعداد پر متفق نہیں ہو سکی۔بعض نے ایک خاص تعداد میں کُتب کو الہامی ہونے کا درجہ دیا، تو بعض نے اُس تعداد میں اضافہ کر دیا۔مسیحیت کے پروٹسٹنٹ فرقہ کی بائبل میں 66 کُتب ہیں، کیتھولک بائبل 73 کُتب پر مشتمل ہے اور مشرقی آرتھوڈکس فرقہ کی بائبل 81 کُتب کی حامل ہے۔

لٰہذا یہاں اصولی معیار یہ ہو گا کہ قرآنی دعویٰ کی نوعیت کو جزوی تفصیلات کی بجائے قرآنی پیراڈائیم کے نقطہءِ ارتکاز اور فکری مُدعاء کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جائے کہ کون کون سی کُتب قرآن کے پیش کردہ توحیدی معیار پر پورا اُترتی ہیں اور وحیِ الٰہی کی عکاسی کرتی ہیں۔اِس پر مزید گفتگو آگے آ رہی ہے۔اعتراض پر مبنی تحریر پڑھ کر معلوم پڑتا ہے کہ ملحد امجد حسین یہودی دینیات، الٰہیات اور تاریخ سے قطعاً واقف نہیں، کیونکہ اگر وہ اِن سے واقف ہوتا تو تسڈل کی تحقیق سے آگے بڑھ کر کچھ تفصیلات خود بھی شائع کرتا کہ کون سی یہودی کُتب میں کیا معاملات چل رہے ہیں اور اُن کا موضوع ومقصد کیا ہے۔تاہم مصنف نے محض زہر افشانی کی، لیکن کوئی تفصیلات مہیا نہیں کیں۔مُلحد کی آسانی کے لیے یہ معلومات یہاں درج کی جا رہی ہیں۔

یہودی دینیات "تصورِ قانون" (תּוֹרָה) پر کھڑی ہے اور اِس سے منتھی تصورِ حیات اِسی قانون کے تابع ہے۔چونکہ دینِ موسیٰؑ کی بنیاد "توریت" ہے، جو کہ کتابِ شریعت ہے۔اِس لیے بنی اسرائیل کے لیے سب دینی سچائیوں کا منبع وماٰخذ یہی کتاب ہے اور باقی سب تحریریں، تقریریں اور تعبیریں توریت کی تفسیر ہیں۔توریت کو آج کی دُنیا میں The Law کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔تاہم دلچسپ امر یہ ہے کہ یہودی قانون دو حصوں پر مشتمل ہے، جس کی یہ تحریری شکل ہے، جبکہ اِس کے علاوہ ایک دوسری شکل "زبانی قانون" (Oral Torah یا Oral Law) کی بھی ہے، جو اپنی نوعیت میں اسلامی علمِ حدیث، تفسیر اور فقہ سے مماثلت رکھتا ہے، لیکن اِس لحاظ سے ممتاز ہے کہ اِس میں اکثر قانون سازی انبیائے کرامؑ کی جانب سے کی گئی ہے، جو آگے چل کر یہودی روایت ودرایت کا حصہ بن گئی۔ بعد ازاں، آلِ اسرائیل نے اِس کو اپنی سماجی، سیاسی، معاشی اور مذہبی زندگی میں "Levites" یعنی کاہنوں کے زیرِ سایہ توریت کے متوازی استعمال کرنا شروع کر دیا۔

بنی اسرائیل کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت موسیٰؑ کوطور پر دو طرح کی توریتیں ملی تھیں۔ایک وہ تھی جو تحریری شکل میں موجود ہے اور ایک کو حضرت موسیٰؑ نے تحریر نہیں کیا بلکہ وہ سینہ بسینہ ہی چلتی اور منتقل ہوتی رہی۔ یہ قانون آلِ اسرائیل کی الہامی تاریخِ قانون سازی، تفسیر اور ہزار سالہ فکری ارتقاء پر محیط ہے۔اِس کو "طالمود" (תַּלְמוּד) کہتے ہیں ("تالمود" لکھنا مستعمل ہے)، جس کی دو اہم شکلیں "تالمودِ یروشلم" اور "تالمودِ بابل" ہیں۔مزید برآں، تالمود کے دو اندرونی اہم حصے ہیں جن کے نام "مشناح" (מִשְׁנָה) اور "گمورا" (גמרא) ہیں۔

تالمود کی قانونی شکل کو مسیحیت کی پیدائش کے وقت تک یہودی علماء نے سیل کر کے حتمی رُوپ دے دیا تھا اور اِس کے الہامی معیار کو یہود کے سبھی فرقے تسلیم کرتے تھے (سوائے آٹھویں صدی میں مشرقی یورپ میں ظاہر ہونے والے "قرائیم" فرقے کے)۔تالمود کو بالآخر جب تحریری شکل میں لایا گیا اور اِس کی قانونیت (Canonization) کو حتمی قرار دیا گیا تو اِس عمل کو "ہلاکاہ" (הֲלָכָה) یعنی "راستہ پر چلنے" کا نام دیا گیا۔یہودی "تناخ"، جسے مسیح "عہد نامہ قدیم" کہتے ہیں اور جو توریت، کتبِ انبیاء، اور کتبِ حکمت پر مشتمل ہے، کے بعد "تالمود" یہود کی معتبر ترین کتاب ہے، جس کو یہودی عقائد کے مطابق الہامی سمجھا جاتا ہے اور یہودی علماء تالمود کی بنیاد پر کیے گئے فیصلوں کو حتمی سمجھتے ہیں۔توریت درحقیقت شریعت کے 613 اصولوں کا مجموعہ ہے، جن میں سے اکثریت "کتابِ استثناء" میں وارد ہیں، جبکہ تالمود اِن اصولوں پر انبیاء اور یہودی صالحین وفقہاء کی جانب سے ڈالی گئی روشنی اور عملی تشریح پر مشتمل ایک وسیع سلسلہ ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ملحد امجد حسین نے ایسا آخر کیونکر سمجھ لیا کہ قرآن نے سابقہ کُتب کے تذکرہ میں "تالمود" کا ادراک نہیں کیا ہو گا؟ کیا رسول اللہ (ﷺ) کے سامنے محض توریت ہی پڑھی جاتی تھی یا زُبانی قانون یعنی تالمود کو بھی بیان کیا جاتا تھا؟ اگر تو قرآن انسانی کلام ہوتا، تو محمد رسول اللہ (ﷺ) کے لیے بہت آسان تھا کہ سبھی یہودی کُتب کے سلاسل کو یہودِ مدینہ سے سُن کر قرآن میں ترتیب سے بیان کر دیتے اور اُن کی جزئیات پر بھی بحث کر ڈالتے۔تاہم قرآنِ کریم کا ایک ایک لفظ شاہد ہے کہ قرآن کا مُدعاء یہ نہیں ہے، لٰہذا قرآن نے سابقہ کُتب کو عمومی زاویئے سے تذکرہ کی زینت بنایا ہے اور پوری الہامی تاریخ کو ایک 'واحد سلسلہءِ وحی' (Organic Whole) میں پرو کر کلامِ الٰہی متصور کیا۔اِس عمل میں چونکہ ماٰخذ خود خدا کا علم ہے، لٰہذا حتمی حوالہ کے طور پر "وحیِ الٰہی" کی سابقہ تاریخ کو اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا اور اُن سب تفصیلات میں جانے سے گریز کیا گیا ہے کہ کون سے واقعات کن کُتب میں وارد ہوئے ہیں۔یہ محض استدلال نہیں، بلکہ قرآن کا اپنا بیان ہے کہ کتاب اللہ میں واقعات اور حادثات کا بیان

انسانیت کے "سبق" کے لیے ہے اور واقعاتی تفصیلات سے زیادہ اہم پیغامِ توحید و تقویٰ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن یاد دہانی کے ساتھ بار بار دعوتِ فکر بھی دیتا ہوا نظر آتا ہے۔
"آپ سے پہلے بہت سے مثالیں گزر چکی ہیں۔ پس آپ سب زمین میں چل کر دیکھیں کہ کیسا انجام تھا جھٹلانے والوں کا۔" (سورہ آلِ عمران، آیت 137) "بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل کے سامنے وہ اصل باتیں پیش کرتا ہے، جس میں وہ زیادہ تر اختلاف کرتے ہیں۔" (سورہ نمل، آیت 76)
ملحد امجد حسین کی طرف سے اُٹھائے گئے اعتراض کے جواب کے لیے ہمیں قدیم تاریخ میں جانا پڑے گا تاکہ فتویٰءِ تاریخ کے سامنے کسی کو انکار کی جرات نہ ہو اور سبھی ملحدوں کی زُبان بندی یکبارگی ہی کر دی جائے۔ محمد رسول اللہ (ﷺ) نے اعلانِ نبوت 610ء میں کیا اور تب آپ (ﷺ) کی عمرِ مبارک 40 برس کے لگ بھگ تھی۔ تب تک آپ متحرک تجارتی زندگی سے کسی حد تک کنارہ کشی کر چکے تھے اور آفاقی سچائیوں اور انسانی وجود کی حقیقت پر گہرے تدبر اور تفکر کے مراحل سے گزر رہے تھے۔ تاہم معاشرتی معاملات میں آپ کی شمولیت بدرجہ اتم جاری تھی، جس کا ثبوت 608ء میں حجرِ اسود کی خانہ کعبہ میں تنصیب کا واقعہ ہے۔ جب مکہ میں پہلی وحی (سورہ علق) نازل ہوئی تو اُس کے اندر توحید وربوبیت کا جو آفاقی پیغام تھا، بالکل وہی پیغام 632ء میں نازل ہونے آخری وحی "کہ آج ہم نے آپ کے لیے آپ کا دین مکمل کر دیا" (سورہ مائدہ) میں بھی اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ موجود تھا۔ نہ تو کہیں انداز میں فرق تھا اور نہ ہی مرکزی فکرودینی پیغام میں کوئی جھول ظاہر ہوا۔ شروع سے آخر تک قرآن کا انداز ایک ہی رہا جو لاشریک الوہی ہستی کی جانب سے زمین پر چُن لیے گئے "عبد" کی طرف ترسیلِ احکامات وپیغامات کا حامل تھا، جبکہ اِس ابلاغ مابین خالق ومخلوق میں صیغہ ہمیشہ "امر" یعنی حکمیہ ہی رہا (حکمیہ میں "امر ونہی" دونوں داخل ہیں)۔
سوچنے کی بات ہے کہ اگر قرآن ایک انسانی کاوش ہوتا، جس کے مآخذ سابقہ کُتب، علاقائی کہانیاں، عرب مشاہیر کی داستانیں، عجم کے قصے اور خطے کی توہم پرستیاں تھیں، تو قرآن کا باہم مربوط اور مکمل ہونا ممکن نہ تھا۔ ایسی صورت میں نہ صرف قرآن میں بے شمار جھول پائے جاتے، بلکہ مصنف پیغام کی جامعیت اور ترسیل وترویج دونوں کے معاملے میں چُوک بھی جاتا۔ تاہم ایسا کبھی نہ ہوا، بلکہ قرآن تحریری شکل میں آنے سے پہلے بارہا عرب کے خاص وعام کے سامنے پڑھا گیا، یہودی اور مسیحی علماء کے سامنے اِس کی آیات رکھی گئیں اور اِن کو عرب کے طول وعرض میں بطورِ الٰہیاتی اورتاریخی حوالہ کے طور پر پیش کیا گیا، لیکن کیا عربی، کیا یہودی وعیسائی، کسی کو اِن آیات کی مخالفت کرنے اور کھلی کھلی دعوت کے باوجود قرآن میں سے تضاد ڈھونڈ کرلانے کی ہمت نہ ہو سکی۔ اِس پر مزید قرآن کے اِس "چیلنج" نے سونے پر سہاگہ والا کام کیا کہ اگر الزامات لگانے والے سچے ہیں اور قرآن کی مخالفت میں استقامت رکھتے ہیں تو اِس کلام جیسی ایک "سورت" ہی بنا لائیں۔ تاہم اِس چیلنج کو قبول کرنے کی ہمت کسی کو نہ ہوئی اور بڑے بڑے فُصحائے عرب کی زُبانوں پر قُفل پڑ گئے۔
یہ تاریخی حقیقت ہے کہ قرآنی سورتوں کی جواکثریت مکہ میں نازل ہوئی اور اِن سورتوں کی خاصیت یہ ہے کہ اِن میں اسلام کی دینی فکر، فلسفہءِ الٰہیات، دینیاتی قواعد اور تصوراتِ مابعد الطبیعات مکمل کر دیئے جا چکے تھے۔ ایسا کہنے سے مراد یہ ہے کہ اِسلام کا تصورِ توحید، تصورِ وحی، تصورِ نبوّت و رسالت اور تصورِ آخرت سبھی اپنی کامل شکل میں آ چکے تھے اور اسلام اپنی بنیادوں پر تاریخ کی مکمل روشنی میں قائم ہو چکا تھا۔ اگر کہیں کوئی ارتقاء جاری تھا تو وہ مراحل عبادات اور خانگی زندگی کے امور کے تھے، جن کا بہرحال "عقائد" کے ساتھ کوئی موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا تنقیدی نظر سے دیکھنے پر بھی معلوم ہو گا کہ مدینہ میں یہود کی موجودگی اور اُن سے رسول اللہ (ﷺ) کا ملنا جُلنا اِسلام کے تصوراتِ مابعد الطبیعات پر کسی قسم کا کوئی اثر نہ چھوڑ سکا۔ یہاں اعتراض یہ ہے کہ اسلام نے یہود سے بہت کچھ مستعار لیا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہودیت کی دورِ ہجرت کے ابتدائی پانچ سالوں میں اسلام کے قُرب وجوار میں موجودگی اسلامی فکر کے اندر نہ تو کوئی اضافہ کر سکی اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی کمی لا سکی۔ تاہم قرآنی وحی کا سیاق وسباق بدل گیا اور اُن واقعات کو یہود کے ساتھ معاملات اور مذاکرات کے رُوپ میں پیش کیا جانے لگا جو اُن کی اپنی تاریخ میں آلِ اسرائیل کی غلطیاں اور گستاخیاں ظاہر کر رہے تھے۔ اِس نوعیت کی تبدیلی کو ہم اصولی (Doctrinal) تبدیلی کی بجائے ذیلی تبدیلی ہی کہیں گے۔ یہاں یہ واضح کر دیا جانا

بھی ضروری ہے کہ اسرائیلیات کی صنف محض "مدنی سورتوں" کا خصوصی پہلو نہیں ہے، بلکہ شریعت وتاریخِ بنی اسرائیل کے حوالہ جات "مکّی سورتوں" میں بھی موجود ہیں، جو یثرب کے یہودیوں کے ساتھ میل جول سے پہلے نازل ہو چکی تھیں۔

اب سوال یہ اُٹھتا ہے کہ کیا رسول اللہ (ﷺ) کا یہودِ عرب سے معانقہ زمانۂ قبل از وحی یا ہجرت سے پیشتر عہدِ وحی میں رہا تھا؟ عرب میں یہود کی دو اہم بستیاں یثرب اور خیبر تھیں۔اِس کے علاوہ یہود کا کہیں کوئی قابلِ ذکر وجود نہیں تھا۔ فلسطین میں یہودیوں کے رہنے پر پابندی تھی، کیونکہ 70ء میں رومیوں کی فتح فلسطین کے بعد یہودیوں کو بغاوت کے خطرہ کے پیشِ نظر خطۂ فلسطین سے جلاوطن کر دیا گیا تھا اور دوبارہ آبادکاری کی اجازت نہیں دی گئی تھی (یہ اجازت حضرت عمر فاروق نے 638ء میں فتح بیت المقدس کے موقع پر یہودیوں کو دی تھی)۔ بعد ازاں جب رومی سلطنت نے مسیحیت قبول کی تو یہودیوں کے لیے معاملاتِ زندگی اور بھی مشکل ہو گئے کیونکہ مسیحیوں نے "یہواہ" کے پیروکاروں سے چُن چُن کر بدلے لیے۔ للذا وہ مجبوراً مصر، یورپ، فارس اور ایشیائے کُوچک کے دُوراُفتادہ علاقوں کی طرف نکل گئے۔ عین ممکن ہے کہ عرب میں بسنے والے یہودی بھی رومی و مسیحی ظلم و استبداد سے بچنے کی خاطر صحرائے عرب کی گہرائیوں میں نکل آئے ہوں اور آباد ہو گئے ہوں۔

ایسی صورت میں یہ امکان نہ ہونے کے برابر ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) کا یہودی علماء کے ساتھ کوئی باقاعدہ میل جول رہا ہوگا۔ تاہم اگر کسی یہودی فرد کے ساتھ کوئی انفرادی مُلاقات ہوئی بھی ہو تو کیا ہم اصولاً ایسی ایک، دو یا چند ملاقاتوں سے قرآنِ کریم اور احادیثِ نبوی میں موجود خالص یہودی تاریخ، علومِ تناخ وتالمود اور شریعتِ موسوی کے قوانین جیسے علومِ کثیرہ کو منسوب کر سکتے ہیں، کہ یہ سارا علم محمد (ﷺ) نے اِنہی چند ملاقاتوں میں حاصل کر لیا تھا اور آپ (ﷺ) اِن تفصیلات کو عہدِ نبوّت میں وقفہ وقفہ سے استعمال کرتے رہے؟

کم ازکم عقلِ سلیم اِس بات کو تسلیم کرنے کی اجازت نہیں دیتی، جبکہ تاریخی تحقیق بھی اِس بات کا کوئی ثبوت فراہم کرنے سے معذور ہی رہی۔ پس یہ اعتراض کہ قرآنی اسرائیلیات درحقیقت یہودیوں سے مسلمانوں کے معانقہ کا نتیجہ ہے، نہ صرف بھونڈا ہے، بلکہ معترضین کی جہالت کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ یہودی دینیات میں زمانۂ مابعد از مسیح کے ارتقاء اور تالمود کی تحریری شکل میں آمد کے عمل کے اندر صحرائے عرب کے یہودیوں کا کوئی کردار نہیں تھا۔ وہ تو پہلی صدی عیسوی سے ہی باقی یہود سے الگ تھلگ ہو کر یہاں گمنامی میں آباد ہو گئے تھے اور اُن کو بعد میں ہونے والی مذہبی تبدیلیوں سے کوئی واقفیت نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عربی کی عمومی مذہبی فضاء میں تالمود اور مدراشیم کا ذکر کہیں نہیں ملتا اور نہ ہی یہودِ عرب اِس کی موجودگی سے واقف معلوم ہوتے ہیں۔ للذا یہ امر مصدقہ ہے کہ محمد (ﷺ) کے پاس تالمود کے واقعات تک رسائی کے لیے کوئی بھی مؤثر وغیر مؤثر ذریعہ سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ پس یہ کیسے ممکن تھا کہ قرآنِ کریم کے بیان کردہ وہ واقعات جو تالمود میں بھی مذکور ہیں، وہ یہودِ مدینہ کی مذہبی داستانوں سے ماخوذ ہوتے؟

اگر دوسری طرف مسیحیت کے متعلق بات کی جائے تو آج تک کی دو ہزار سالہ تاریخ شاہد ہے کہ مسیحیوں کو نہ تالمود سے کبھی کوئی غرض رہی ہے اور نہ ہی اُن کا علمی معیار کبھی اِس قابل ہو سکا کہ یہودی الہیات ودینیات کا احاطہ کر سکے۔ تالمود سے مسیحی علماء کو اگر کوئی غرض تھی تو اتنی ہی تھی کہ اِس کے ذخیرہ کے اندر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے لیے مناسب الفاظ استعمال نہیں کیے گئے اور اُن کی توہین کی گئی ہے۔ پس یہاں مسیحیت کا کردار دفاعِ عقیدہ کے معاملہ تک ہی محدود رہا۔

ایسی صورت میں قرآن کا بنی اسرائیل کی تاریخ سے معاملہ کرنا اور کتبِ تناخ کے ساتھ ساتھ تالمود اور مدراشیم کے اندر تک کی باتیں بیان کر دینا کسی اعجاز سے کم نہیں۔ معلوم تاریخ سے ثابت شدہ ہے کہ بائبل کا پہلا جزوی عربی ترجمہ گیارہویں صدی عیسوی میں دستیاب ہوا، جبکہ اِس سے پہلے ایسا کوئی مخطوطہ یا مصحف موجود نہ تھا جسے محمد (ﷺ) بطورِ ماخذِ اسرائیلیات استعمال کر سکتے۔

اسلامی علوم میں اسرائیلیات کی باقاعدہ شمولیت وسطی دورِ صحابہ کی بات ہے، جب کعب الاحبار اور وہب بن منبہ وغیرہ نے اپنے یہودی علمی پسِ منظر کے بل بوتے پر مسلمانوں کو اسرائیلیات کی باقاعدہ تعلیم دینا شروع کی۔ اِن اصحاب سے پہلے کوئی ایسا سلسلہ موجود نہ تھا جس سے علومِ اسرائیلیات کا حصول

ممکن ہوتا۔ واضح رہے کہ یہ دونوں اصحاب زمانۂ تابعین سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا یہ امر طے شدہ ہے کہ محمد (ﷺ) کے لیے اسرائیلی تاریخ کے حصول کے علمی ذرائع قطعی طور پر ناپید تھے۔ اِسی طرح آپ بنی اسرائیل کے خطِ تاریخ (History Timeline) کا بھی دُنیوی ذرائع سے کوئی علم نہ رکھتے تھے۔ ایسی حساس صورتحال میں اِس امر کا کُلی امکان موجود تھا کہ آپ موسیٰؑ کو داوٗدؑ کے بعد کی کوئی شخصیت قرار دے دیتے یا پھر ابراہیمؑ کو نوحؑ سے پہلے رکھ دیتے، یا ممکن ہے کہ عزیرؑ کو بُخت نصر کی تاراج یروشلم سے پہلے کی تاریخ میں داخل کر دیتے۔ یقیناً خالصتاً انسانی کاوش کے نتیجہ میں اِس بات کا صد فیصد امکان تھا کہ اِسی طرح کی کچھ تاریخی نوعیت کی اغلاط سامنے آ جاتیں جس سے اسلام کا پورے کا پورا دینی "تھیسز" ہی اُلٹ جاتا۔ تاہم ایسا نہ ہوا اور ہر بات تاریخِ بنی اسرائیل کے عین مطابق بیان کی گئی جس پر خود یہود بھی انگشتِ بدنداں تھے۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ محمد (ﷺ) کوئی مؤرخ تو نہ تھے جو فنِ تاریخ کی پیچیدگیوں سے واقف ہوتے اور جنھوں نے کسی معروف مؤرخ کی شاگردی کر کے تاریخ نگاری شروع کی ہوتی۔ آپ (ﷺ) ایک اُمّی ہستی تھے، جنھوں نے کسی بھی شعبۂ علم یا فن کی کوئی رسمی تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ گفتگو کی اِس نہج پر پہنچ کر اِس بات کا اظہار ضروری ہے کہ قرآن نے محض اسرائیلی واقعات ہی نہیں، بلکہ زمانۂ قدیم کی ہر چیز خطِ تاریخ کے عین مطابق پیش کی ہے۔ لہٰذا قرآنی تاریخ بائبل و تالمود کی نسبت نہ صرف صحیح ترین ہے، بلکہ یہ اسرائیلیات کے مؤرخین کی تاریخ کو بھی ہر درجہ تک دُرست کرتی ہے۔ یاد رہے کہ تاریخ کے متعلق یہ دعویٰ بنا ثبوت نہیں ہے، کیونکہ ہم اِس کے ثبوت ذیل میں پیش کرنے جا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر بائبل مقدس کی کتابِ پیدائش جب حضرت ابراہیمؑ کا سفرِ مصر بیان کرتی ہے تو بادشاہِ مصر کو "فرعون" کہہ کر پکارتی ہے۔ یہ ایک صریح تاریخی غلطی ہے، جسے اصولِ تاریخ کی زُبان میں Anachronism کہتے ہیں۔ "اور یُوں ہوا کہ جب ابرام مصر میں آیا تو مصریوں نے اُس عورت کو دیکھا کہ وہ نہایت خوبصورت ہے۔ اور فرعون کے اُمرا نے اُسے دیکھ کر فرعون کے حضور میں اُس کی تعریف کی اور وہ عورت فرعون کے گھر میں پہنچائی گئی۔" (کتابِ پیدائش، باب 12، آیات 14 تا 15)

اِسی طرح بائبل یوسفؑ کے زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے بھی بادشاہِ مصر کو "فرعون" ہی کے لقب سے ملقب کرتی ہے، جبکہ یہ زمانہ حضرت ابراہیمؑ سے محض تین پُشتیں بعد کا زمانہ ہے۔ بائبل کی کتابِ پیدائش میں تحریر ہے: "تب یُوسف نے فرعون سے کہا کہ فرعون کا خواب ایک ہی ہے۔ جو کچھ خُدا کرنے کو ہے اُسے اُس نے فرعون پر ظاہر کیا ہے۔" (کتابِ پیدائش، باب 41، آیت 25)

دلچسپ امر یہ ہے کہ "فرعون" کا لقب مصری بادشاہت کے نئے دورِ سلطنت (New Kingdom) کے بادشاہ نے پندرہویں صدی قبلِ مسیح میں اختیار کیا تھا جو کہ اصلاً مصری لفظ "پار-آ" (عربی، فار-آ) تھا، جس کا مطلب ہے "عظیم محل"۔ مصری بادشاہ کے لیے اختیار کیا گیا یہ خطاب مصری فرمانروا "توت موسس" کے دور میں سامنے آتا ہے جس کا ثبوت ماہرینِ آثارِ قدیمہ کو مصری مقبروں کی دریافتوں سے ملا ہے۔ اِس سے قبل مصر کے بادشاہ کو "بادشاہ" ہی کہا جاتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ اکیسویں صدی قبل مسیح سے اُنیسویں صدی قبل مسیح کے درمیان کا ہے، لہٰذا یہ بات تاریخی طور پر مسلمہ ہے کہ مصری بادشاہ اُس دور میں کوئی بھی خطاب رکھتے ہوں، کم از کم "فرعون" نہیں کہلواتے تھے۔ تاہم، اِس حقیقت کے باوجود بائبل نے ابراہیمؑ کا واقعہ بیان کرتے ہوئے مصری بادشاہ کو فرعون کہہ کر ہی مخاطب کیا۔ یہ چیز قرآن کے اِس مقدمہ کو اور مضبوط کرتی ہے کہ بائبل تحریف شدہ ہے۔ جب ہم دوسری طرف یہ واقعہ قرآن میں دیکھتے ہیں، تو قرآن بائبل کی یہ غلطی دُرست کرتا ہوا نظر آتا ہے، کیونکہ قرآن حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ میں فرعون کا تذکرہ بالکل نہیں کرتا، جبکہ حضرت یوسفؑ کے واقعاتِ مصر میں مصری بادشاہ کو فرعون کہنے کی بجائے "بادشاہ" (عربی، "ملک") کے عمومی عنوان سے ہی مخاطب کرتا ہے۔ تاہم جب یہی بات حضرت موسیٰؑ کے زمانہ پر پہنچتی ہے، جو کہ پندرہویں یا چودھویں صدی قبل مسیح کا واقعہ ہے، تو مصری بادشاہ کے لیے قرآن "فرعون" کا لقب ہی پیش کرتا ہے، جو تاریخی تناظر میں صد فیصد دُرست ہے۔

ہم قرآن میں اِس احتیاط اور فرق کو ابھی ایک نظر دیکھ لیتے ہیں۔ "اور بادشاہ نے کہا کہ میں نے خواب میں سات موٹی گائیں دیکھی ہیں، جنھیں سات پتلی گائیں کھا رہی ہیں۔۔۔" (سورہ یوسف، آیت 43)

"اور اُن کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرعون اور اُس کے درباریوں کی طرف اپنی نشانیوں کے ساتھ مبعوث کیا۔ پس اُنھوں نے تکبر کیا اور مجرموں میں شامل ہو گئے۔" (سورہ یونس، آیت 75)

پس ثابت ہوا کہ قرآنِ کریم نے بائبل وتالمود میں مذکورواقعات، تصورات اور تاریخ کی تصحیح کی ہے۔اِس لیے جہاں جہاں بھی قرآن اور بائبل میں واقعات کے بیان میں فرق آتا ہے اور قرآن کی جانب سے اضافی معلومات فراہم کی جاتی ہیں، اُسے چربہ، غلطی، تحریف، ذاتی تخلیق یا موضوع روایت سمجھنے کی صریح غلطی نہ کی جائے، کیونکہ اِس کو ذرائع تاریخ سے کبھی ثابت نہیں کیا جا سکے گا۔ درحقیقت، قرآن کی جانب سے ایسا کیا جانا محض اصل تاریخ کا بیان ہے، کیونکہ وقت کی توڑ پھوڑ نے بائبل اور تالمود کے اندر بھی اپنے نقوش چھوڑ دیئے تھے اور وحی کے بیانات انسانی اضافوں کے بعد اپنی اصلی شکل سے ہٹ گئے تھے۔ لہٰذا اُن کو اصل شکل میں بحال کرنا ازحد ضروری تھا۔اِسی طرح اسرائیلیات کے ایک اور اہم واقعہ کا ذکر یہاں اِسی ضمن میں ضروری ہے۔ یہ واقعہ "ہامان" کا ہے جس کو بائبل کی کتاب "آستر" (Esther) نے سلطنتِ فارس کے شہنشاہ "ہوشیارشاہ" (Xerxes) کا درباری اور ماہرِ تعمیرات بتایا ہے۔ دوسری طرف قرآنِ کریم ہامان نامی شخص کو مصری بادشاہ فرعون کے دربار میں رکھتا ہے اور اُس کو ماہرِ تعمیرات ہی قرار دیتا ہے۔چونکہ بائبل پہلے لکھی گئی، لہٰذا اکثریت کا یہی ماننا ہے کہ قرآن کا نقطہءِ نظر اِس موضوع پر غلط ہے اور محمد (ﷺ) کو معاذ اللہ کسی غلط فہمی کی بنا پر ایسا معلوم ہوا۔یہی وجہ ہے کہ صدیوں سے مسیحی قرآنِ کریم کے اِس بیان کا مذاق اُڑاتے آ رہے ہیں۔حالانکہ سچائی خود یہودونصاریٰ پر آج کھل رہی ہے اور وہ اِس بات کا اعتراف کر رہے ہیں کہ "آستر" نامی کتاب، جو بائبل مقدس میں شامل ہے، ایک تاریخی افسانہ (Historical Fiction) ہے جو یہودیوں کی بُختِ نصر کے ہاتھوں "بابل" (Babylon) کی طرف جلاوطنی کے بعد اُن کی دلجوئی کے لیے لکھا گیا تھا۔(حوالہ، Universal Jewish Encyclopedia - آرٹیکل: Esther)

آیئے اب اِس موضوع پر قرآن کا مقدمہ دیکھتے ہیں۔"فرعون نے کہا: اے ہامان، میرے لیے اُونچا محل بناؤ، تاکہ میں راستوں تک پہنچ سکوں۔" (سورہ مومن، آیت 36) دلچسپ امر یہ ہے کہ مصر سے آثارِ قدیمہ کی چند اہم دریافتوں نے یہ عُقدہ بھی کھول دیا ہے۔اوّل تو "ہامان" مصری زُبان کا ہی لفظ ہے، جِد کو مصری "ہ-م-ن" (HMN) سے لکھتے تھے، جبکہ علمِ لسانیات کے مطابق اِس طرز کا نام فارسی الاصل نہیں ہے، کیونکہ اِس کے ہجے فارسی اصولوں پر پورے نہیں اُترتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آسٹریا کے شہر ویانا کے Kunsthistorisches Museum میں رکھے گئے ایک تختی نُما قدیم مصری پتھر پر واضح لفظوں میں ہامان کا نام لکھا ہے اور ہامان کو فرعون کے دربار کا ماہرِ تعمیرات ہی بتایا گیا ہے۔لہٰذا اِس امر میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا کہ ہامان فرعونِ مصر کے ہی دربار میں ملازم تھا۔جو قارئین اِس حوالہ پر مشکوک ہیں، وہ Egyptian Treasures in Europe کا پانچواں حصہ دیکھ سکتے ہیں۔

اِس کے علاوہ ایک اہم استدلال جو قرآن کے حق میں جاتا ہے وہ اُونچی تعمیرات کی کثرت کے متعلق ہے۔ہم سب جانتے ہیں کہ بلندوبالا قدیم عمارتوں کے لیے سرزمینِ مصر معروف ہے، فارس نہیں۔ مصر میں انتہائی اونچے اہرام موجود ہیں، جبکہ تاریخی شہر "لکسور" کا شاہی محل اپنی طرز کا ایسا عجوبہ ہے جو دوہیکل ہونے کے ساتھ ساتھ فنِ تعمیر کا شاہکار بھی ہے۔لہٰذا یہاں بھی بات صاف ہو جاتی ہے کہ قرآن نے بائبل سے مواد نقل نہیں کیا، بلکہ قرآن کا مآخذ وحیِ الٰہی ہے اور قرآن بلاشبہ بائبل میں شامل کردہ انسانی اضافوں اور اغلاط کو بھی دُرست کرتا ہے۔

اِس ضمن میں تیسرا اہم واقعہ فرعون کے بحیرہ احمر میں ڈوبنے کا ہے۔یہ واقعہ تب پیش آیا تھا جب مصر سے خروج بنی اسرائیل کے وقت فرعون اپنے لاؤ لشکر سمیت اُن کا پیچھا کر رہا تھا اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) حکمِ الٰہی سے بحیرہ احمر کے پانیوں پر اپنا عصاء مار کر خشک راستہ حاصل کر چکے تھے۔ایسے موقع پر جبکہ بنی اسرائیل سمندری پانی کی فصیلوں کے درمیان چلتے جا رہے تھے، تو فرعون کو خیال گزرا کہ غلاموں کا اتنا بڑا سرمایہ یُوں ہاتھوں سے نہیں جانے دیا جا سکتا، لہٰذا سمندر کے اندر بھی پیچھا جاری رکھنا چاہیے۔پس وہ پانی میں گُھس گیا اور اپنے لشکر سمیت وہیں غرقاب ہو گیا۔ یہاں تک بائبل مقدس اور قرآنِ مجید کا بیان تقریباً ایک جیسا ہی ہے۔ لیکن اِس سے آگے فرعون کے ساتھ کیا معاملہ ہوا، اِس پر بائبل خاموش ہے، جبکہ یہ گرہ

قرآن واضح اعلان کے ساتھ 1400 سال پہلے کھول چکا ہے۔ بائبل کا بیان ہے کہ: "اور پانی پلٹ آیا اور اُن نے رتھوں اور سواروں اور فرعون کے سارے لشکر کو جو اسرائیلیوں کا پیچھا کرتا ہوا سمندر میں گیا غرق کر دیا اور ایک بھی اُن میں سے باقی نہ چھوٹا۔" (خروج، باب 14، آیت 28)

گفتگو کے اِس مرحلے پر سورہ یُونس کی آیت 92 خاص طور پر اہم ہے، جہاں ایک وقت میں تین الگ الگ جہتوں کو بیان کر کے اعجازِ قرآن کا ایک اور ثبوت فراہم کر دیا گیا ہے۔

"اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے پار کر دیا، جبکہ فرعون اور اُس کے لشکر نے سرکشی اور تعدّی سے اُن کا تعاقب جاری رکھا، یہاں تک کہ پانیوں نے آن گھیرا۔ اِس پر وہ پکارا کہ میں ایمان لایا اُس (خدا) پر جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اطاعت گزاروں میں سے ہوں۔ (کہا گیا) اب یہ (فرمانبرداری) اور پہلے سرکشی و فساد کرتا رہا؟ تو آج ہم تمہارے وجود کو تمہارے جسم میں محفوظ کر دیتے ہیں، تاکہ تو آنے والی نسلوں کے لیے نشانِ عبرت رہے، اور بے شک بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے غفلت برتتے ہیں۔" (سورہ یونس، آیات 90 تا 92)

سورہ یُونس میں فرعون کے ماضی کے کردار اور موت کو بیان کیا گیا ہے، جبکہ وہ الفاظ بھی پیش کیے گئے ہیں جو فرعون نے اُس وقت کہے تھے جب وہ ڈوب رہا تھا۔ تاہم یہاں سب سے اہم بات جو قرآن کو بائبل سے ممتاز بناتی ہے وہ فرعون کے جسم کو محفوظ کر دینے کی پیشین گوئی ہے۔ قرآن نے واضح لفظوں میں جسم کی نجات کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی کہا ہے کہ یہ بعد میں آنے والے لوگوں کے لیے ایک نشانی ہو گی۔ قرآن کا یہ بیان بائبل مقدس کے بیان سے زائد ہے اور بائبل اِس سے قطعی طور پر لاعلم ہے۔ یہاں صاف معلوم ہو رہا ہے کہ قرآنِ کریم فرعون کی لاش کے محفوظ کر دیئے جانے کا ذکر کر رہا ہے اور یہ بات زور دے کر کہی جا رہی ہے کہ دُنیا میں سرکشی کرنے والا خود ایک نشانِ عبرت بن جائے گا۔

یہاں حیران کُن طور پر جو بات قابلِ توجہ ہے وہ قرآن کا مصری فنِ حنوط سازی (Mummification) کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ مصریوں نے فرعون کی لاش کو پانی سے نکال کر حنوط کیا اور محفوظ انداز میں اُس کے مقبرہ میں رکھ دیا تھا۔ بعد ازاں یہی لاش مصر کی "مُردوں کی وادی" (Dead Valley) سے 1898ء میں دریافت کی گئی۔ بعد ازاں اِس پر ایک فرانسیسی سرجن "ڈاکٹر موورائس بوکائیے" نے 1970ء کی دہائی میں تحقیق کی اور نتیجہ نکالا کہ اِس ممی میں موجود فرعون کی موت پانی میں ڈوب کر غوطے اور جھٹکے لگنے سے ہوئی تھی۔ ڈاکٹر موورائس بوکائیے نے ان دریافتوں کو اپنی مشہورِ زمانہ کتاب "The Bible, the Quran and Science" میں درج کیا، جبکہ اِس کے کچھ عرصہ بعد ہی اسلام بھی قبول کر لیا۔

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر حضرت محمد (ﷺ) کو کیسے معلوم ہوا کہ فرعونِ موسیٰؑ کی لاش محفوظ کر کے مصری مقبرہ میں رکھ دی گئی ہے اور وہ ایک دن منظرِ عام پر آ جائے گی؟ یاد رہے کہ یہ واقعہ رسول اللہ (ﷺ) کی بعثت سے کم وبیش دو ہزار سال قبل پیش آیا۔ ماضی میں پیش آ چکے کسی نامعلوم واقعہ کے ذِکر کو انگریزی میں Postdiction کہتے ہیں، جو مستقبل کی طرف کی گئی پیشین گوئی سے بھی زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے اِس پیشین گوئی کو کسی اور انداز میں لے کر اِس پر یہ اعتراض لگا دیا کہ قرآن فرعون کے ایمان لے آنے پر اُس کی نجات اور پانی سے بچ نکلنے کی بات کر رہا ہے، حالانکہ قرآن کے سیاق وسباق اور اِس آیت کے تناظر سے کہیں بھی یہ بات ظاہر نہیں ہوتی کہ نجات سے مراد فرعون کا زندہ بچنا اور ایمان کی زندگی گزارنا تھا۔ یہودی کتاب "مدراش ملکوت" (Midrash Malkut) میں یہ ذکر موجود ہے کہ فرعون کو خدا نے زندہ بچا لیا۔ تاہم قرآن کا بیان اُس سے قطعی مختلف ہے اور مستقبل بعید کی طرف ایک اہم پیشین گوئی کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآنِ کریم میں شروع سے آخر تک فرعون کو ایک ملعون شخص کے طور پر ہی پیش گیا گیا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے والد اور آتشِ نمرود کے حوالے سے قرآن پر کی گئی ملحد کی تنقید پر تبصرہ ایک الگ مضمون میں پیش کیا جائے گا اس میں قرآنی مؤقف پر اُٹھائے گئے ملحدانہ اعتراضات کا پوری طرح سے ابطال سامنے آئے گا۔ اِسی طرح قرآن کے اندر پیش کردہ مسیحیت کی عمومی تصویر، بالخصوص اِس کے تصورِ تثلیث اور حضرت مریمؑ کی شخصیت وکردار کے حوالے سے بھی جامع گفتگو ایک اور مضمون ("قرآنِ کریم اور مسیحی عقیدہ تثلیث") میں آ گئے گی . لٰہذا اِس سب کے یہاں دُوہرائے جانے کی ضرورت نہیں۔ تاہم اِس کا تذکرہ یہاں اِس لیے ضروری ہے کیونکہ یہ اسرائیلیات کے ہی دیگر پہلو گردانے جاتے ہیں اور موجودہ مضمون اُسی مباحثے کی ابتداء ہے۔ اُمید ہے کہ مُلحد احباب آئندہ قلم اُٹھانے سے پہلے تھوڑی تحقیق بھی کر لیں گے۔ تاہم

وہ جب بھی خلوصِ دل سے معروضی تحقیق کریں گے تو اُن کے سامنے صرف ایک ہی بات ہو گی کہ: "حق آ چکا اور باطل مٹ چکا۔ بے شک باطل کو تو مِٹنا ہی تھا۔" (القرآن)

تحریر سید وقاص حیدر

حضرت ابراہیمؑ تورات اور قرآن

اک تحریر میں مُلحد نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ محمد الرسول اللہ (ﷺ) چونکہ عبرانی وسریانی سے ناواقف تھے، للذا آپ (ﷺ) نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے متعلق یہ سارا واقعہ یہودِ مدینہ کی زُبانوں سے سُن کر اُس کو منظّم عربی متن میں ڈھالا اور الہامی قرآن کا حصہ بنا ڈالا۔ موصوف کے بقول یہ بات ہی نبوتِ محمدیہ (ﷺ) پر سب سے بڑا سوالیہ نشان قائم کرنے کے لیے کافی ہے کہ محمد (ﷺ) یہودیوں سے قصے سُن سُن کر قرآن بناتے رہے۔ میں بجائے اِس کے کہ مزید تبصرہ کے لیے گہرائی میں جاؤں، مناسب رہے گا کہ مُلحد مصنف کی تحریر کا ہی کچھ حصہ یہاں درج کر دیا جائے تاکہ قارئین معترض کی اصل تحریر کے متن اور اِس کے مندرجات سے براہِ راست واقف ہو سکیں اور اُس تحریر کا رد پڑھتے ہوئے اُن کے اذہان میں کوئی ابہامات باقی نہ رہیں۔ مُلحد معترض لکھتا ہے کہ:

دوسرا قصہ حضرت ابراہیم کے آگ سے بچ جانے کا:

"یہ قصہ قرآن میں مکمل طور پر ایک جگہ نہیں ملتا بلکہ تھوڑا تھوڑا متفرق مقاموں پر جا بجا آیا ہے۔ سورہ بقرہ، سورہ انعام، سورہ انبیا، سورہ مریم، سورہ شعرا، سورہ عنکبوت، سورہ صافات، سورہ زخرف اور سورہ ممتحنہ میں ٹکڑوں کی شکل میں یہ قصہ موجود ہے۔ لیکن انبیا کے حالات میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں، مثلاً قصص الانبیا اور عرائس المجالس وغیرہ، ان میں ایک ترتیب و سلسلہ کے ساتھ اس کا بیان ہوا ہے۔ اس کے مطالعے کے بعد اس میں شک کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی کہ یہ قصہ خواہ قرآن میں ہو یا حدیث میں یا دوسری کتابوں میں، سب کا سب یہودیوں کی ایک پرانی کتاب سے ماخوذ ہے جس کا نام "مدراش رباہ (Midrash Rabba) "ہے۔ اس قصے کا موازنہ بھی کلیئر ٹسڈل نے اپنی کتاب میں کافی تفصیلی کیا ہے، لیکن اس سے قطع نظر ہم براہ راست نتیجے تک پہنچتے ہیں۔ جب ہم اس قصے کو یہودیوں کی کتابوں اور قرآن سے ملا کر دیکھتے ہیں تو برائے نام فرق پاتے ہیں جس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ محمد نے اسے ان کتابوں سے نقل نہیں کیا بلکہ یہودیوں کی زبانی سن سنا کر اسے تسلیم کرلیا اور قرآن میں شامل کر دیا۔۔۔ اب سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ یہ افسانہ کہاں سے پیدا ہو گیا؟ واضح ہو کہ توریت، کتاب پیدائش، باب 15، آیت 7، میں جہاں خلیل اللہ کی ہجرت کا ذکر لکھا ہے، وہاں خدا نے ان سے فرمایا، " میں خداوند ہوں جو تجھ کو کلدانیوں کے اور سے نکال لایا"۔ بابلی زبان میں "اور" کے معنی ہیں شہر۔ اس بابلی لفظ "اور" کا ہم شکل ایک اور کلدانی لفظ "اُر" ہے جس کے لغوی معنی شعلہ و آتش کے ہیں۔ مدتوں بعد ایک عبرانی مفسر جوناتھن بن عزئیل (Jonathan Ben Uzziel) نے توریت کا ترجمہ کلدانی زبان میں کیا۔ یہ شخص زبان بابلی زبان سے بالکل ناواقف تھا۔ اس کو ان دونوں لفظوں کے درمیان التباس واقع ہوا اور اس نے بابلی "اور" کو کلدانی "اُر" سمجھ لیا اور آیت کا ترجمہ یوں کر دیا، " میں خداوند ہوں جو تجھ کو کلدانیوں کے آگ کے تنور سے نکال لایا۔" اب یہ صاحب جب اس آیت کی شرح کرنے بیٹھے تو مطلب حل نہ ہوا، چنانچہ ہمارے جمعہ کے خطیبوں کی طرح انھوں نے اپنی واعظانہ شرح میں یہ تمام قصہ بیان کر ڈالا۔ اب یہ غور طلب بات ہے کہ کسی ناواقف شخص کا اس قسم کی غلطی سے متاثر ہو جانا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن حیف کہ اس فرضی افسانے کو خاتم الانبیا حق سمجھ لے جس کا یہ دعویٰ ہو کہ اللہ نے وحی کے ذریعہ انھیں یہ "فرضی افسانہ" سنایا اور اس پر یہ اضافی دعویٰ کہ یہ قصہ لوح محفوظ میں مندرج ہے۔ افسوس، اس غلطی سے اہل یہود کے معمولی محققین تک محفوظ ہیں لیکن لوح محفوظ نہیں۔"

آپ واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں کہ یہ ساری تحریر ہی "چونکہ۔ چنانچہ" کی قیاس آرائیوں پر کھڑی ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اِس تحریر کا مصنف زمین و آسمان کے قلابے ملانے کی سر توڑ کوشش کر رہا ہے۔ تاہم اُس کا المیہ یہ ہے کہ اُس کا اپنا علم محدود ہے اور اُس کی ساری تحقیق انٹرنیٹ پر موجود اِسلام مخالف چند ویب سائٹس پر انحصار کر رہی ہے۔ اِن میں ایک اہم ترین (اور بدنام ترین) ویب سائٹ Answering Islam کے نام سے موجود ہے۔ اِسلام مخالف اکثر مواد یہیں سے اُٹھا کر ترجمہ کے بعد بدنامِ زمانہ الحادی گروپوں میں "گراؤنڈ بریکنگ ریسرچ" کے دعویٰ کے ساتھ پیش کر دیا جاتا ہے اور سادہ لوح قارئین اِس کو من و عن تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اپنا ایمان گنوا بیٹھتے ہیں۔ اِن مُلحدوں کا ایک اور المیہ یہ ہے کہ جب یہ قرآنِ کریم کا موازنہ یہودی و مسیحی کُتب سے کرتے ہیں تو یہ دُوسروں کی تحقیق پر ہی انحصار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کیونکہ یہ خود نہ تو یہودی صحائف کی زُبانوں مثلاً عبرانی(Hebrew)، سریانی(Syriac/Yeddish)، آرامی (Aramaic) وغیرہ سے واقفیت رکھتے ہیں اور نہ ہی مسیحی صحیفے کی زُبان ریختہ یُونانی (Koine Greek) سے کسی قسم کی آشنائی کے حامل ہوتے ہیں۔ للذا اِن کی نام نہاد تحقیق کو منہدم کرنے کے لیے محض اِن زُبانوں کا ہلکا سا علم ہی "ڈائنامائیٹ" کا کام سرانجام دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں اور مذکورہ بالا اعتراض کا حوالہ جاتی ابطال مکمل ثبوتوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ بحث تھوڑی خشک اور علمی طور پر گہری ثابت ہو گی، لہٰذا اِس کے نتائج تک پہنچنے کے لیے آپ کی توجہ اور تحمّل دونوں درکار ہوں گے۔ جس اصل لفظ پر یہ بحث قائم کرکے موصوف نے قرآنِ کریم پر اعتراض گھڑا ہے وہ کُلدانی (Chaldean) زُبان کا لفظ "אוּר" (اُور (Uwr - ہے۔ اِس لفظ کا لغوی معنی ہے "شعلہ (Flame)"۔ بائبل کے "عہد نامہ قدیم (Old Testament)" کی معروف ترین لغت Brown-Driver-Briggs Lexicon کے مطابق "شعلہ" کے معنی کا حامل یہ لفظ "مذکر" ہے۔ مزید برآں، ولیم ہالیڈے کے شہرہ آفاق A Concise Hebrew and Aramaic Lexicon of the Old Testament کے صفحہ 7 پر موجود اندراج کے مطابق "اُور" جمع کا صیغہ ہے اور اِس کا معنی "آگ کی روشنیاں اور تپش" ہے۔ یہ لفظ انہی معانی کے ساتھ عہد نامہ قدیم کی کتاب "یسعیاہ (Isaiah)" کے باب 50، فقرہ 11 میں واقع ہوا ہے۔ لہٰذا جو صاحب اِس لفظ کا ترجمہ "شہر" کر رہے ہیں، اُن کے علم کی حقیقت کی قلعی یہیں کھل جاتی ہے۔ اِسی طرح اِسی لفظ کی ایک دوسری شکل "אוֹר" (اور (Owr - بھی ہے، جس کا معنی "روشن ہونا" ہے اور یہی لفظ اِس بابِ لغت کا مصدر بھی ہے (جس کو عبرانی میں "قال کامل - Qal Perfect - " کہتے ہیں)۔ اب عبرانی و کُلدانی زُبان کے حوالے سے یہ دعویٰ کیا جانا کہ "اُر" اور "اور" دو علیحدہ ابواب کے باہم مختلف معنی کے حامل الفاظ ہیں، جن کے انفرادی معانی "آگ" اور "شہر" کے ہیں، سوائے ٹامک ٹوئی کے کچھ بھی نہیں۔ شہر کے لیے عہد نامہ قدیم (Old Testament) میں استعمال کیا گیا لفظ اصل میں "עִיר" (عیر (Eer - ہے ("ع" اور "الف" کا فرق ملحوظِ خاطر رہے)، جس کو موصوف "اور" کے ساتھ 'خلط' کر رہے ہیں۔ اِسی طرح "آگ/آتش" کے لیے یہودی صحائف کے طول و عرض میں استعمال ہونے والا لفظ "אֵשׁ" (ایش (Aysh - ہے، جس کو اپنی دائمی جہالت کے باعث مُلحد مصنف نے پچھلے لفظ کی طرح "اُر" کے ساتھ خلط ملط کرکے پیش کر دیا ہے۔

چونکہ یہ بحث کثیل لغوی، لسانی اور انشاء پردازی کے تصورات پر مبنی ہے، اِس لیے ہم اِس کو محض لسانی حدود تک ہی محدود رکھیں گے اور اِس واقعے کے حوالے سے کسی دیگر پہلو کی طرف موجودہ گفتگو میں جانے سے گریز کریں گے، کیونکہ مذکورہ بالا حوالہ جات ہی سبھی اعتراضات کی دُھلائی کے لیے کافی ہوں گے۔ جہاں تک عہد نامہ قدیم کی کتابِ پیدائش کے باب 15، فقرہ 7 کا تعلق ہے تو وہاں وارِد ہونے والا لفظ "اُر" در حقیقت "اِسمِ معرفہ (Proper Noun)" ہے (بحوالہ مذکورہ بالا لغاتِ عہد نامہ قدیم)۔ اِس نام سے ملتے جُلتے نام کی ایک اور اہم شہری ریاست "اُروک" بھی قدیم عراق میں موجود تھی۔ واضح رہے کہ قدیم عراق کو آثارِ قدیمہ اور تاریخ میں "میسوپوٹیمیا" کے نام سے پکارا جاتا ہے اور یہ ابتداً "سومیری" لوگوں کی تہذیب کا گہوارہ اور پانچ شہری ریاستوں پر مشتمل مصر (Egypt) کے ہم پلّہ ایک مکمل تہذیبی سلطنت تھا۔ اِس وضاحت کے بعد اب مصنف کی اِس جہالت پر کیا کہا جائے کہ اُس نے "اسمِ معرفہ" کو "اِسمِ نکرہ" بنا ڈالا اور اِس پر ایک ایسا قیاس قائم کر دیا جس کی نہ تو کوئی تاریخی حقیقت ہے اور نہ ہی لسانی ولغوی حیثیت۔ مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ یہی اسمِ معرفہ آلِ اسرائیل کے کئی لوگوں کا نام بھی تھا، جس کا حوالہ خود بائبل میں موجود ہے (دیکھیے 1 تواریخ، باب 11، فقرہ 35)۔

اب آخر میں اِس بحث کو حتمی اختتام تک پہنچانے کے لیے ہیگل (Hegel) کے فلسفۂ تاریخ پر مبنی قیاس کی ہلکی سی ضرورت ہے۔ ہیگل کا فلسفۂ تاریخ ماضی کے استخراج کے حوالے سے "ممکن اور ناممکن (Possibility and Impossibility)" کے تصور پر قائم ہے، جبکہ ذرائع تاریخ (Historical Sources) اور فلسفۂ غالب امکان (Probability) کی قبولیت کا معیار بھی یہ اوّلین اصول ہی ہے۔ ملحدین کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ اُن کا کلیتہً جھکاؤ "Possibility" کی بجائے "Probability" کی طرف ہوتا ہے، جس سے فلسفۂ تاریخ کا بنیادی اصول ہی پامال ہو جاتا ہے، اور نتائج بھی پھر "لولے لنگڑے" ہی نکلتے ہیں، جو الحادی افکار کی مکمل ترجمانی کر رہے ہوتے ہیں، اور در حقیقت یہی ملحدین کی منشاء ہوتا ہے۔ اگر اِسمِ معرفہ یعنی حضرت ابراہیم کے شہر کے نام "اُر" کے متعلق بھی تحقیق کی جائے تو تمہید کے طور پر دیکھنا ہو گا کہ یہ امر بھی "ممکنات" کے اصول پر کھڑا ہے یا نہیں؟ فی الحقیقت دورِ قدیم سے ماضی قریب تک عموماً شہروں اور دیہاتوں کے نام یا تو کسی واقعہ کی طرف نسبت سے رکھے جاتے تھے یا پھر اہم شخصیات سے منسوب کیے جاتے تھے۔ در حقیقت یہ اصول آج بھی پامال نہیں ہوا اور پوری طرح سے آج کے معاشرہ پر بھی لاگو ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ لہٰذا بائبل کے مصنفین کی جانب سے حضرت ابراہیم کے شہر کو "آگ کے شعلوں اور روشنیوں" کا شہر کہہ کر مخاطب کیا جانا اور اِس کا ذکر بائبل کی تحریر کے دور میں، جو کہ 1000 ق م کے بعد کا واقعہ ہے، بطورِ اِسمِ معرفہ کرکے اِسی نام متعیّن سے کر دیا جانا ہرگز اچنبھے کی بات نہیں، بلکہ عین قرینِ حقیقت ہے۔ اِس کا بہترین قیاس بائبل کے اندر موجود معروف ناموں سے کیا جا سکتا ہے، کیونکہ بائبل قدیم انبیاء کے نام اُن کے اوصاف، پیشہ یا بعثت کے

پہلوؤں کو سامنے رکھ کر رقم کرتی ہے۔ مثال کے طور پر پہلے انسان کو "آدم" (אָדָם) محض اِس لیے کہا گیا کیونکہ عبرانی میں "آدمہ" (אדמה) مٹی اور دُھول کو کہتے ہیں، جبکہ انسان مٹی سے بنایا گیا تھا، لہٰذا پہلے انسان کو "آدم" یعنی "مٹی کا بنا ہوا" کہا گیا اور یہی اُس کا نام ٹھہرا۔ اِسی طرح کی ایک اور مثال لفظ "اُردن" (יַרְדֵּן - یردین) سے دی جاسکتی ہے جس کا لغوی معنی ہے "پست جگہ، نیچے جانے والا"۔ بنی اسرائیل دریائے اُردن کے نیچے کی طرف تیز بہاؤ اور اِس کے مضافات کی سطحِ زمین باقی علاقوں کی نسبت گہری ہونے کی وجہ سے اِس خطہ کو "یردین" کے نام سے ہی پکارا کرتے تھے۔ لہٰذا اِس جگہ کا مستقل نام ہی "یردین/اُردن" قرار پاگیا اور آج اِسی نام سے وہاں ایک ملک قائم ہے۔ اِن قیاسات پر نارِ نمرود کے قرآنی بیان کی صداقت کا معیار اِس لیے بھی قائم کیا جاسکتا ہے کیونکہ حضرت ابراہیم والے واقعہ کی تفصیل یہودی "مِدراش" میں موجود ہے، اور یہ بالکل اُسی آیت کی تفسیر ہے جس کے حوالے سے اِس ساری بحث کا غیر حقیقی نتیجہ نکالنے کی کوشش ملحد مصنف نے کی ہے۔

اُوپر پیش کردہ تحقیق کی روشنی میں یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ معترض نے اپنی تحریر میں نہ صرف علمی "ڈنڈی" ماری ہے، بلکہ اُس کا "جوناتھن بن عُزیل" نامی یہودی مفسّر کے متعلق دعویٰ بھی جہالت و غفلت کا نتیجہ ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اہلِ زبان علماء خود اپنی زُبان کے متعلق اِس قدر بڑے مغالطوں کا شکار رہیں، جبکہ دو ہزار سال بعد ایک ایسا شخص اُٹھ کر اُس کی تصحیح کر دے جو خود سِرے سے وہ زُبان جانتا ہی نہیں؟

کتاب پیدائش کے باب 15، فقرہ 7 کی تفسیر یہودی عُلماء کی اکثریت زمانہ قدیم سے بالکل وہی کرتی آرہی ہے، جو قرآنِ کریم میں مذکور ہے۔ "مدراش" درحقیقت یہودی صحائف کے متعلق ترتیب دیئے گئے "اصولِ تفسیر" اور "تفسیرِ تناخ و مِشناء - (Tanakh and Mishna) "تحریری و زُبانی شریعت) کا ہی نام ہے اور دونوں کو "الہامی" سمجھا جاتا ہے۔ "مدراش" یعنی یہودی صحائف کی تفسیر کے عمل کو ترتیب اور تشکیل دینے کا علمی نام "تالمود (Talmud) " ہے جبکہ اِسی عمل کی تکمیل کو "گیمارہ (Gemara) " کہتے ہیں۔ دُوسرے لفظوں میں یہودی تالمود بھی مذکورہ بالا بائبلی حوالہ کی تفسیر بالکل یہی کرتی ہے، جس کا ذکر قرآنِ کریم میں حضرت ابراہیم کے "نارِ نمرود" والے واقعہ کی صورت میں موجود ہے۔ مزید عرض کرتا چلوں کہ حضرت ابراہیم کو آگ میں پھینکے جانے والی تفسیر صرف "مِدراش ربّاح" (מדרש רבה) نامی مِدراش میں ہی موجود نہیں، بلکہ یہودی تالمود کی دیگر کئی کُتب (مدراشیم) کا حصہ بھی ہے، لہٰذا مدراش رباح کے نام سے مخصوص کرکے کیا گیا یہ دعویٰ بھی مُلحد مصنف کے محدود علم کی طرف ہی اشارہ کرتا ہے، جس کا مرتکب محض یہ ملحد معترض ہی نہیں ہوا، بلکہ Clair Tisdall نامی متعصب عیسائی مصنف، جس کی طرف مُلحد معترض نے اپنی تحقیق کا حوالہ لوٹایا ہے، بھی اپنی اِسلام مخالف تحریروں میں اِسی گمراہی کا مجرم قرار پاتا ہے۔

اب اِس مضمون کے دوسرے حصے کی طرف چلتے ہیں۔ دوسرا اہم اعتراض جو محولہ بالا اعتراض پر مشتمل گفتگو کا ہی حصہ ہے وہ درج ذیل ہے:

"محمد نے قرآن میں ابراہیم کے باپ کا نام "آزر" لکھا ہے۔ حالاں کہ مدراش رباہ میں توریت کے اعتبار سے اس کا نام "تارح" آیا ہے لیکن یونانی مورخ یوسی بیوس (Eusebius: 263-339 AD) جس کی تاریخ کا ترجمہ سریانی یعنی شامی زبان میں بھی ہوا تھا، ابرہیم کے باپ کا نام "آثر" لکھتا ہے۔ اب یہ بات تو خیر بتانے کی ضرورت نہیں کہ محمد کو تجارت کے سلسلے میں اکثر شام کے سفر کا اتفاق ہوا تھا، چنانچہ انھوں نے وہیں یہ نام سنا ہوگا اور کمزور یادداشت کے سبب "آثر" کا "آزر" لکھ دیا۔ ایرانیوں نے اکثر اسی آزر کو اپنی زبان کی مناسبت سے "آذر" بھی لکھا ہے جس کے معنی "آتش" کے ہیں۔ مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ محمد نے اس قصہ کو نہ یہود سے لیا اور نصاریٰ سے بلکہ جبرائیل نے بلاواسطہ انھیں وحی کے ذریعہ دیا اور اب یہودیوں نے بھی اسے قبول کرلیا ہے، چونکہ وہ بھی ابراہیم کی اولاد ہیں۔ لیکن شاید انھیں یہ معلوم نہیں کہ اس افسانہ کو ماننے والے یہودیوں میں صرف عوام الناس شامل ہیں (جیسے کئی غلط روایتوں پر آمنا صدقنا کہنے والے مسلمان مل جاتے ہیں)، لیکن جو یہودی علما ہیں، ان کے نزدیک یہ افسانہ بے بنیاد ہے۔"

اِس بچگانہ اعتراض اور اِس کو قلمبند کرنے کے انداز پر طنز و مزاح کے نشتر چلانے کو جی چاہتا ہے۔ تاہم، چونکہ اسلام کا دفاع ایک سنجیدہ معاملہ ہے اور تاریخِ مذہب اور کُتبِ سماوی کی سچائی تاریخی نقد کے ذریعے پرکھے جانے سے تعلق رکھتا ہے، لہٰذا لازم ہے کہ سنجیدگی سے اعتراض کا ردّ کیا جائے۔

جواب کا آغاز معترض کے جملے "چنانچہ انھوں نے وہیں یہ نام سنا ہوگا اور کمزور یادداشت کے سبب "آثر" کا "آزر" لکھ دیا" سے کرتے ہیں۔ جیسا کہ ایک اور مضمون میں بھی ذکر کیا جاچکا ہے کہ ملحدین "قیاس آرائی" کرنے اور "ذاتی مفروضے" کو تاریخی استدلال کی بنیاد بنانے میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے، لہٰذا اُن سے بعید نہیں کہ

رائی کا پہاڑ بنادیں۔ ذرا اِسی جملے سے دیکھ لیجیئے کہ ایک ایسے شخص کو "کمزور یادداشت" کا حامل قرار دیا جارہا ہے جس نے انسانی تاریخ کا سب سے بڑا انقلاب بپا کیا، جس نے قرآن جیسے کتاب کی آیات محض ایک دفعہ اپنی زُبان سے ادا کر دینے کے بعد ہر بار اُسی انداز میں تلاوت کیں اور کبھی نہ چُوکا، اور جس کی ذہانت و فطانت کے معترف اُس کے دشمن بھی تھے۔ کس قدر ڈھٹائی سے یہ بات کر دی ملحد نے بنا سوچ سمجھے اور ساتھ ہی اپنا گھڑا ہوا "اصولِ تاریخ" بھی بیان کر دیا، جو نہ معلوم کون سی یونیورسٹی میں پڑھایا جاتا ہے۔

جارج سیل (George Sale) انگریزی زُبان میں قرآنِ کریم کا سب سے پہلا مترجم ہے اور اُس کے ترجمہ و حوالہ جات سے آج بھی استفادہ کیا جاتا ہے۔ جارج سیل کا کہنا ہے کہ یہ نام درحقیقت "آذر" ہی تھا اور یہ کُلدانی، اسیری اور فارسی (پہلوی) زُبانوں میں اِسی طرح لکھا اور پُکارا جاتا تھا۔ آذر درحقیقت فارسیوں کے لیے "مارچ" کا مہینہ تھا، جس کی نسبت قدیم عراق (میسوپوٹیمیا) کے مشرقی حصے میں "سیارہ مریخ" سے تھی، اور لوگ اِس کو "دیوتا" سمجھتے تھے۔ لہٰذا آذر نام کا حامل ہونا درحقیقت قابلِ فخر بات تھی اور اشرافیہ کے لوگ طاقتور دیوتا کے ساتھ اِس گہرے تعلق پر اتراتے ہوتے تھے۔ قدیم پہلوی زُبان میں بھی آذر کو آذر ہی بولا جاتا تھا اور آذر آگ کا دیوتا تھا، جس کو مریخ ہی سے منسوب کیا جاتا تھا۔ لہٰذا یہ نام قدیم فارس میں بھی مذہبی رنگ میں پایا جاتا تھا۔ لیکن خطہءِ فارس آذر نام کا اصل وطن نہیں، بلکہ یہ نام قدیم عراقی ستارہ پرستی پر مشتمل بُت پرستی کی مذہبی زُبان سے تعلق رکھتا تھا۔ جارج سیل کے مطابق "تارح" یا "آذر" دونوں ایک ہی شخصیت کے نام ہو سکتے ہیں، جبکہ یہ بھی ممکن ہے کہ تارح نام کے شخص کو اُس کے اشرافیائی مقام کی بدولت شاہی دربار یا اعلیٰ مذہبی طبقہ کی جانب سے یہ نام انعام کی صورت میں عطاء کیا گیا ہو، کیونکہ یہ نام دیوتا سے نسبت کے باعث مقدس سمجھا جاتا تھا۔

یہودی تالمود حضرت ابراہیم کے والد کا نام "ذارہ" یا "ذرّہ" لکھتی ہے جو کہ اُسی مصدر سے مشتق ہے جس سے "آذر" نکلا ہے۔ یہاں جو امر قابلِ غور ہے، وہ یہ ہے کہ یہودی تالمود اِس معاملے میں موسیٰؑ سے منسوب کُتبِ توریت سے متضاد مؤقف کیوں اختیار کر رہی ہے۔ قرآن کو آپ ایک لمحے کے لیے ایک طرف رکھ دیں، کیونکہ قرآن بعد میں نازل ہوا اور اِس کا تعلق بھی غیر یہودی لوگوں سے ہے، لہٰذا اِس کا حوالہ شاید تاقدین قبول کرنا پسند نہ کریں۔ تاہم یہودی تالمود جو کہ توریت کی تفسیر قرار دی جاتی ہے، اُس نے ہی توریتِ مقدس کی بہم فراہم کردہ معلومات پر اعتماد کا اظہار کرنے سے انکار کرتے ہوئے "تارح" یا "تارخ" (תָּרַח) نام کو قبول نہیں کیا، بلکہ ایک دُوسرا نام متعارف کروایا ہے، جو وہی نام ہے جسے قرآنِ کریم نے بھی اپنے اندر جگہ دی ہے۔ اِس صورتحال سے جو منطقی نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں وہ یہ ہیں کہ یا تو (الف) دونوں نام ایک ہی شخصیت کے تھے جو کہ حضرت ابراہیمؑ کے والد تھے، یا پھر (ب) آذر ہی اُن کا حقیقی نام تھا کیونکہ یہودی محققین، مفسرین، اور مؤرخین نے اِسی نام پر اعتماد کا اظہار کیا، اور مسیحی مؤرخ "یوسی بیوس" نے بھی اِسی روایت کو قبول کیا۔ تاہم (ج) اگر تارح نام دُرست ہے اور آذر غلط ہے تو پوری کی پوری یہودی تاریخ کو دُرست کرنا پڑے گا اور بڑے بڑے بُرج اُلٹ کر ہی یہ نام حضرت ابراہیمؑ کے والد کے نام کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے۔ اب یہ مُلحدین پر ہے کہ وہ مذکورہ بالا میں سے کون سی "آپشن" اختیار کرتے ہیں۔

ملحدین کا یہ دعویٰ کہ حضرت ابراہیم کے والد کا نام "تارح" یا "تارخ" تھا، محض اِس بنیاد پر کھڑا ہے کہ بائبل مقدس حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام تارح بتاتی ہے۔ کتابِ پیدائش کے باب 11 میں تارح کی نسل کا ذکر ہے۔ اِس شجرے کو عہد نامہ جدید میں "متی (Matthew)" اور "لوقا (Luke)" کی انجیلوں کے مصنفین نے دُہرایا ہے۔ (نوٹ: متی کی اِنجیل حضرت ابراہیمؑ تک ہی شجرہ محدود رکھتی ہے اور آپؑ کے والد کا ذکر نہیں کرتی)۔ تاہم، بائبل کے مصنفین کے پاس کوئی سند یا تاریخی ریکارڈ موجود نہیں تھا جس سے وہ اِس بات کی مکمل تصدیق کر پاتے کہ حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام تارح ہی تھا۔ بات کو اِس ضمن میں آگے بڑھانے سے پہلے ملحدین سے سوال ہے کہ یہ کیسے ملحدین ہیں جو خدا کو تو نہیں مانتے لیکن بائبل کی کہی ہوئی بات کو مِن و عن تسلیم کر کے "الہام" کا درجہ دے رہے ہیں اور قرآن سے نفرت کی آگ میں وہ اِس بات پر بضد ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام بائبل کے عین مطابق تارح ہی تھا؟ کس درجہ کا تضاد ہے اِن کے قول و فعل میں۔ اگر آج آپ کسی ملحد سے صرف اتنا پوچھیں کہ کیا حضرت ابراہیمؑ نامی کوئی ہستی تاریخ میں واقعتاً گزری ہے تو جھٹ سے جواب دیا جائے گا، "نہیں!" اِس کے ساتھ یہ اضافہ بھی ہو گا کہ یہ لوک داستان یا کسی دیومالا کا قصہ ہے۔ لیکن دوسری طرف جب قرآن ایک مؤقف اختیار کرتا ہے تو یہ لوگ جھٹ سے اُس کو جھٹلانے کی ضد میں کچھ بھی ایسا قبول کر لیتے ہیں جس کا عام حالات میں سرے سے انکار کرتے ہیں۔

"اور جو لوگ حق کا انکار کرتے ہیں اور ایمان والوں سے کہتے ہیں کہ تُم ہمارے طریق کی پیروی کرو، تمہارا جُرم ہمارے ذمہ ہوگا۔ حالانکہ وہ اُن کی خطاؤں کا بوجھ اُٹھانے والے نہیں۔ بلکہ وہ تو بلاشبہ جھوٹے ہیں۔" (سورہ عنکبوت، آیت 12)

بائبل پر اندھا اعتماد رکھ کر قرآن کو جھٹلانے کی کوشش کرنے والے شاید نہیں جانتے کہ بائبل خود حضرت ابراہیمؑ سے کم و بیش ایک ہزار سال بعد تحریر کی جانی شروع کی گئی، جبکہ اِس کی یہودی قانون کے مطابق حتمی شکل 90ء میں منعقدہ یہودیوں کی "جامنیہ کونسل" میں تشکیل پائی۔ Documentary Hypothesis کے مطابق موجودہ یہودی توریت، جو حضرت موسیٰؑ کی طرف منسوب ہے اور بائبل کی ابتدائی پانچ کُتب پر مشتمل ہے، کو کم از کم چار مختلف مکاتبِ فکر (J, E, P, D) کے کاتبین نے تحریر کیا اور اِس کا متن لگ بھگ پانچ سو سال ارتقاء پذیر رہا، یہاں تک کہ چھٹی صدی قبل مسیح میں حضرت عزیرؑ کے زمانہ میں کتابِ استثناء (Deuteronomy) کی حتمی شکل بندی کے بعد توریت مکمل ہوئی۔ اگرچہ کاتبین کی جانب سے اضافے پھر بھی جاری رہے اور توریت و کُتبِ انبیاء کا متن یہودی جلاوطنی اور مرکزی یہودی معبد کی تباہی کے بعد یہودی عبادت گاہ "سیناگوگ کی پیدائش (Second Temple Judaism) "کے عرصہ کے دوران بھی تبدیل ہوتا رہا، لیکن ہمارا مقدمہ اِس سے پہلے کے حالات میں بھی بڑی آسانی سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ درحقیقت بائبل کے متن پر کسی طور اعتماد نہیں کیا جا سکتا، اور اِس کو جب مسیحی عہد نامہ جدید کی روشنی میں دیکھا جائے تو تضاد اِس قدر واضح ہو جاتا ہے کہ کسی اور ثبوت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ مثلاً انجیلِ متی اور انجیلِ لوقا میں جو شجرے حضرت عیسیٰؑ کو حضرت داؤدؑ کی نسل سے ثابت کرنے کے لیے پیش کیے گئے ہیں، اُن دونوں میں باہم ایک دو یا چار نہیں بلکہ پوری 15 پُشتوں کا فرق ہے۔ انجیلِ متی کا مصنف حضرت ابراہیمؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک 41 پشتیں بتاتا ہے، جبکہ انجیلِ لوقا کا مصنف یہی تعداد 56 بتاتا ہے۔ اِس کے علاوہ، متی کا مصنف اپنے شجرے میں حضرت عیسیٰ کے نام نہاد والد یوسف کو "ایلی" کا بیٹا بتاتا ہے، جبکہ لوقا کی انجیل کا مصنف یوسف کو "یعقوب" کا بیٹا قرار دیتا ہے۔ یہاں آپ خود اندازہ کر لیجیئے کہ بائبل کی تاریخ کے متعلق سچائی کا معیار تو ادنیٰ سے ادنیٰ محقیق بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوگا۔

"یوسی بیوس (Eusebius) "مسیحی کلیسیاء کا سرکاری مؤرخ تھا، جس کی شہرہ آفاق تصنیف "تاریخ کلیسیاء (Ecclesiastical History) "ہے۔ قدیم کُلدانی لفظ "آذر" کو کلیسیاء کے اِس مؤرخ نے "آثر" محض اِس لیے لکھا کیونکہ وہ کُلدانی، عبرانی اور آرامی الفاظ کا لاطینی میں ترجمہ کر رہا تھا اور لاطینی بھاری "ذ" کے ہجے کی آواز سے محروم تھی۔ لاطینی چونکہ کلیسیاء کی سرکاری زُبان تھی، لہٰذا سبھی عُلوم کا لاطینی میں منتقل کیا جانا مسیحیت کی بقاء کے لیے ازحد ضروری تھا۔ چونکہ یہاں مُلحد معترض نے یوسی بیوس کے لیے خود "مؤرخ" کا لفظ استعمال کر دیا ہے، لہٰذا اُس کو اِتنا یاد کروا دیا جانا ضروری ہے کہ مؤرخ کے اُوپر تحقیق کی ذمہ داری لاگو ہوتی ہے اور اُس کا مقصد محض لفاظی یا غلو کو پیش کرنا نہیں ہوتا، بلکہ وہ مختلف ذرائع تاریخ اور ماخذوں کی مدد سے ماضی کی تعمیرِ نو کرتا ہے اور اُس کی بنیاد پر تاریخ کے متعلق اپنا مقدمہ پیش کرتا ہے۔ اب یہاں ایک اور منطقی سوال پیدا ہوتا ہے، جو کہ ہماری اِس گفتگو کے لیے انتہائی اہم ہے اور یہ سوال مُلحدین سے ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر "تارح" یا "تارخ" ہی حضرت ابراہیمؑ کے والد کا اصل نام تھا، تو مسیحی مؤرخ کیلیسیاء یوسی بیوس نے مسیحی صحائف کی گواہی قبول کیوں نہیں کی؟ یہ گواہی نہ صرف عہد نامہ قدیم سے دستیاب ہے (حوالہ: کتابِ پیدائش، باب 11، آیت 27)، بلکہ عہد نامہ جدید کی انجیل لوقا میں بھی حضرت ابراہیم کی ولدیت "تارح/تارہ" ہی لکھی ہوئی ہے (حوالہ: انجیلِ لوقا، باب 3، آیت 34)۔ لہٰذا مسیحی مؤرخ کے لیے لازم تھا کہ وہ دوسرا کوئی حوالہ قبول کرنے کا خیال بھی دِل میں نہ لاتا اور اِس بات کو مِن و عن تحریر کر کے بائبل پر اپنے ایمان اور اعتماد کا اظہار کرتا۔ تاہم بوجوہ ایسا نہ ہو سکا۔ شاید اُن وجوہات کا علم مُلحدین کو ہو جن کی بِنا پر مسیحی مؤرخ نے بائبل کی نسبت تالمودی روایت پر اعتماد کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔

اِس سلسلے میں آخری نقطہ قرآنِ کریم کے متعلق ہے۔ عموماً یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ جو چیز پہلے آتی ہے وہ نہ صرف "دُرست" ہوتی ہے، بلکہ اُس کے بعد میں آنے والی کوئی بھی دُوسری چیز جو وہی بات دوہرا رہی ہوتی ہے لازماً پہلی کی نقل یا چربہ ہوا کرتی ہے۔ اصولِ منطق (Informal Logic) میں اِس امر کو Fallacy قرار دیا جاتا ہے اور اِس خاص صورتحال کے لیے جو اصطلاح استعمال کی جاتی ہے وہ "Argument of Straw" ہے۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ سچ محض ایک ہی ہوتا ہے اور اُس کا بیان بار بار بھی کیا جائے تو وہ سچ وہی رہے گا جو وہ اپنی اصل ماہیت میں تھا۔ اگر دس لوگ ایک ہی سچائی بیان کریں تو لازم نہیں کہ پہلے شخص کے بعد باقی نو لوگوں کو ہم نقّال کہہ کر اُن کی بات کو ردّ کر دیں۔ یہ عقل و دانش سے عاری روّیہ ہوگا۔ لہٰذا اِس ضمن میں یہ بات قابلِ فکر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ تاریخ میں ایک ہی بار پیدا ہوئے اور اُن کے والد بھی ایک شخصیت تھے جو ایک زمانے میں ایک ملک کے اندر موجود تھے۔ اُن کا نام جو بھی تھا وہ اُن کے وجود کا تاریخی حادثہ ہونے کا وقت

گزرنے کے بعد کبھی تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا اگر اُن کا اصل نام تالمود پیش کرے، کوئی مسیحی مؤرخ پیش کرے، یا پھر قرآنِ کریم پیش کرے، وہ سچائی ایک ہی رہے گی اور اُس کی قبولیت کے لیے ہم کسی ایک ذریعے کو قبول کرکے باقی کو مسترد نہیں کر سکتے، کیونکہ اگر مسترد کرنا ہوگا تو سبھی کو کرنا ہوگا اور سچائی کا قابلِ اعتماد متبادل ذریعہ پیش کرنا ہوگا، ورنہ مُلحدین کے لیے خاموشی کے ساتھ قبولیت ہی بہترین حل ہے۔

تحریر سید وقاص حیدر

قرآن مجید اور مسیحی عقیدہ تثلیث- ملحدین کے اعتراضات کا علمی محاسبہ

سید امجد حسین نامی ایک ملحد مصنف، کی جانب سے قرآنِ پاک اور رسول اللہ (ﷺ) پر کئی ایک اعتراضات اُٹھائے گئے ہیں اور اِن اعتراضات پر مشتمل ایک فہرست قلمبند کی گئی ہے۔ یہاں راقم الحروف کی جانب سے ایک انتہائی اہم نوعیت کے اعتراض کا جواب دیا جا رہا ہے۔ لہٰذا اُمید ہے کہ قارئین آخر تک پڑھ کر غیر جانبداری سے نتائج نکالیں گے۔

اِس سلسلے کی پہلی کڑی میں ہم قرآن میں بیان کردہ "تصورِ تثلیث" پر بات کریں گے۔ چونکہ اسلام اور مسیحیت دونوں ہی تبلیغی ادیان ہیں اور دونوں کے درمیان علمی و عملی جنگ زمانۂ قدیم سے جاری ہے، لہٰذا دونوں کی جانب سے ایک دوسرے پر اعتراضات کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے۔ اس عمل میں مسیحیت کا طرزِ عمل شدت پسندی اور نفرت و حقارت کا حامل ہے، جبکہ مسلمانوں کی جانب سے مسیحیوں کو "اہلِ کتاب" کے درجہ پر فائز کیے جانے کے سبب قدرے نرمی برتی جاتی رہی ہے۔ دلچسپ امر ہے کہ "تثلیث (Trinity)" کے قرآنِ کریم کے پیش کردہ تصور کے غلط ہونے کا راگ مسیحی علماء ایک عرصے سے الاپ رہے ہیں اور اب یہی "ماچس" ملحد "بندروں" کے ہاتھ میں آ چکی ہے۔ تاہم اِس موضوع پر گفتگو کیے جانے سے قبل اِس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ سبھی اعتراضات نئے نہیں ہیں، بلکہ پرانی شراب کو نئی بوتل میں ڈال کر پیش کیا گیا ہے۔

دورِ جدید کی اسلامی Apologetics کو اُٹھا کر دیکھا جائے تو سطحی سوچ کے حامل انسان کو بھی یہ بات روزِ روشن کی طرح عیّاں ہو جاتی ہے کہ ایسے سبھی اعتراضات (اور بے شمار خرافات) کا تسلی بخش جواب دیا جا چکا ہے۔ لیکن نفسِ معاملہ یہ ہے کہ اپنی "ڈھیٹ" فطرت کی وجہ سے یہ معترض بار بار منہ کی کھانے کے باوجود اُنہیں اعتراضات مختلف حیلے بہانوں سے گھڑتے اور پیش کرتے رہتے ہیں۔ ہماری اِس سرگرمی کا کوئی ماحاصل نہیں، سوائے اِس کے کہ ہمارے قارئین اپنے ایمان پر اطمینان اور یقین رکھ سکیں اور ایمان کسی قسم کے خطرات سے دوچار نہ ہو۔

اِن سبھی اعتراضات کو "ابنِ ورق" کے قلمی نام کے حامل ایک اسلام دشمن مصنف نے مختلف مستشرقین کی کانٹ چھانٹ کر کے اپنی مرضی کا مواد سیاق و سباق کی ذرا بھی پرواہ کیے بغیر اُٹھا لیا اور اپنی تدوین کردہ نصف درجن سے زائد کُتب میں قلمبند کر دیا۔ اسلام کے خلاف زہر افشانی کرتی اِن کُتب میں چند معروف کُتب کے نام یہ ہیں:

The Quest for Historical Muhammad

Why I am not a Muslim

What the Koran Really Says

The Origins of the Koran

Which Koran?

Koranic Sources

آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہاں عنوانات میں ہی سارا زور قرآنِ کریم کو جھٹلانے پر لگا دیا گیا ہے۔ یہی وہ مآخذ ہیں جہاں سے ملحدین مواد اُٹھا کر اپنے نام سے شائع کرتے ہیں، یا پھر انٹرنیٹ پر موجود چند عیسائی ویب سائٹس اِن کی مرغوب غذا، یعنی اسلام مخالف مواد فراہم کرنے میں پیش پیش نظر آتی ہیں۔ قارئین پر واضح کرتا چلوں کہ یہ سب باتیں آج سے دو سو سال پہلے تب شروع ہوئی تھیں جب "مستشرقین" نے مشرقی ادیان بالخصوص اسلام کا تنقیدی مطالعہ شروع کیا تھا اور اِس عمل کے لیے بعینہٖ وہی اُصول اپنائے گئے تھے جو یورپ کے روشن خیالوں نے بائبل مقدس کے حقیقی تاریخی مآخذوں کھوجنے کے لیے اپنائے تھے۔ یعنی مسیحیت کے پروکار اِن مستشرق علماء نے اپنی الہامی کتاب کے خلاف پہلے سے استعمال شدہ حربوں کو اسلام پر جارحیت کے لیے استعمال کیا اور اسلام کو مغربی طرز کی منہ زور تکنیک "Deconstructionism" کا نشانہ بنا ڈالا۔ اِس طرح کوشش کی گئی کہ کسی طرح اسلام کے زمینی مآخذوں تک پہنچا جائے، تاہم اِس کوشش میں سبھی متعصب مستشرقین کو منہ کی کھانی پڑی۔ لہٰذا مستشرقین کی پوری تحریک کی کوشش ناکام گئی اور اِسلام بجائے پیچھے ہٹنے کے پوری آب و تاب سے مزید پھیلنے لگا۔

بات کو آگے بڑھانے سے پہلے ضروری ہے کہ ملحد مصنف کا اعتراض ایک دفعہ پڑھ کر اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔ ملحدوں کے سرخیل سید امجد حسین فرماتے ہیں:

ملحد کی طرف سے پیش کردہ اختراع محمدی تثلیث :

پہلے اس ضمن میں ہم قرآن کی کچھ آیات دیکھ لیتے ہیں:

" ○ اور جب خدا فرمائے گا کہ اے عیسیٰ بن مریم! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری والدہ کو معبود مقرر کرو؟......"(سورہ المائدہ: 116)

" ○اے اہل کتاب! تم اپنے دین میں حد سے نہ نکلو اور اللہ کی شان میں سائے پکی بات کے نہ کہو، بے شک مسیح عیسیٰ مریم کا بیٹا اللہ کا رسول ہے اور اللہ کا ایک کلمہ ہے جسے اللہ نے مریم تک پہنچایا اور اللہ کی طرف سے ایک جان ہے، سو اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر ایمان لاؤ اور نہ کہو کہ خدا تین ہیں، اس بات کو چھوڑ دو تمھارے لیے بہتر ہو گا، بے شک اللہ اکیلا معبود ہے، وہ اس سے پاک ہے اس کی اولاد ہو، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین ہے اور اللہ کارساز کافی ہے۔"(سورہ النساء 171 ○)

"جنھوں نے کہا اللہ تین میں سے ایک ہے، بے شک وہ کافر ہوئے حالاں کہ سوائے ایک معبود کے اور کوئی معبود نہیں اور اگر وہ اس بات سے باز نہ آئیں گے جو وہ کہتے ہیں تو ان میں سے کفر پر قائم رہنے والوں کو دردناک عذاب پہنچے گا۔" (سورہ المائدہ: 73)

محولہ بالا آیات سے صاف عیاں ہے کہ محمد نے کچھ بدعتی عیسائی فرقوں کے عقائد کے متعلق سن رکھا تھا کہ وہ خدا کو تین (تثلیث) گمان کرتے تھے، یعنی خدا، مریم اور عیسیٰ، جب کہ یہ عقیدہ عیسائیت کے بنیادی عقیدے کے بموجب کفر ہے۔ توریت کتاب استثنا، باب 6، آیت 4، میں صاف صاف لکھا ہوا ہے کہ "سن اے اسرائیل، خداوند ہمارا خدا اکیلا خداوند ہے۔" انجیل مرقس، باب 10، آیت 29 میں عیسیٰ نے اسی آیت کا حوالہ دے کر بڑی تاکید کے ساتھ اس کی تصدیق کی، "تمھارا اکیلا رب ہے۔" آج بھی کوئی راسخ العقیدہ عیسائی مریم کی الوہیت کا قائل نہیں ہے۔"

یہاں بات کو اِس کی حتمی شکل میں لے کر جانے سے پہلے سید امجد حسین صاحب کو میں یہ چیلنج دے رہا ہوں کہ وہ اُس "بدعتی" عیسائی فرقہ کا نام بتادیں جو اِنہی تین (باپ، ماں اور بیٹا) کو خدا تسلیم کرتا تھا۔ صرف ایک ایسے فرقہ کا تذکرہ ہی کر دیں، جس کے عقائد بقول اُن کے یہی تھے کہ اللہ کے ساتھ ساتھ مسیح اور مریم دونوں شریک تثلیث ہیں اور "خداوند" ہیں۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جہاں امجد حسین موصوف اُوپر ایک جانب عیسائی بدعتی فرقہ کا ذکر کر کے تثلیث کی محولہ بالا خاندان نما تکونی شکل کی تصدیق کرتے ہیں، وہیں یہ ملحد صاحب یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ عیسائیوں کا ایسا کوئی عقیدہ نہیں جس میں حضرت مریم کو خدا کا ایک رُوپ یا عین ذاتِ خدا کا حصہ تسلیم کیا گیا ہو۔ وہ اِس دعویٰ کی تصدیق کے لیے "راسخ العقیدہ عیسائی" کی اصطلاح استعمال کر کے جہاں علمیت جھاڑتے ہوئے نظر آتے ہیں، وہیں اپنی جہالت کا اعلان بھی ببانگِ دُھل کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے اور یقین جانیں اِس کہاوت کی مثال امجد حسین نامی ملحد کی محولہ بالا خود ساختہ تاریخ نگاری سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

چونکہ قرآن ساتویں صدی میں نازل ہوا اور اُس وقت مسیحی دُنیا بازنطینی سلطنت کے زیرِ سایہ تھی جو سلطنتِ روما کی مشرقی باقیات پر مشتمل تھی۔ مغربی باقیات سیاست کی جگہ مذہب نے ترکہ میں پائی تھیں اور روم میں "پوپ" کو مسیحی دُنیا کی سرداری حاصل ہو گئی تھی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جنہیں آج راسخ العقیدہ کی اصطلاح کا سہارا لے کر ملحد معترض "عیسائی" کہہ رہے ہیں، کہیں وہ لوگ بعد کے زمانہ کی پیداوار تو نہیں اور کہیں یہ حوالہ ہی تاریخی غلطی یعنی Anachronism پر مبنی افسانہ تو نہیں؟ امجد حسین سے سوال ہے کہ کیا آج تک مسیحیت میں کوئی ایسی نظریاتی بنیاد سب میں باہم قابلِ قبول رہی ہے کہ جس کی بنیاد پر "راسخ العقیدہ" اور "بدعتیوں" کا فیصلہ کیا جا سکے؟

بات کو آگے لے کر چلتے ہیں۔ مسیحیت میں پہلا پوپ "پطرس رسول (Apostle Peter)" کو کہا جاتا ہے اور اِس بات کا حوالہ انجیلِ متی باب 16، فقرہ 18 سے دیا جاتا ہے جہاں حضرتِ مسیح پطرس کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ہیں کہ اِس چٹان (پطرس) پر میں اپنی کلیسیا تعمیر کروں گا۔ زمانۂ پطرس سے آج تک پوپ کیتھولک مذہب کا اٹوٹ سلسلہ رہے ہیں اور آج بھی عیسائی دُنیا کا غالب مذہب رومن کیتھولک مسیحیت ہی ہے۔ ساتویں صدی میں جب قرآن نازل ہوا تو اُس زمانہ میں کیتھولک

مسیحیت ہی مسیحی دُنیا کی "راسخ العقیدہ" شکل تھی۔ بازنطینی سلطنت بھی عقائد کے معاملات میں کیتھولک مذہب سے مختلف نہ تھی، اور محض نام میں "آرتھوڈکس" کہلوانا پسند کرتی تھی، جو کہ خالصتاً سیاسی مقاصد کے لیے تھا۔ اِسی طرح آرتھوڈکس کا سربراہ "پوپ" کی بجائے "Patriarch" پیٹریارک) یعنی "سربراہ" کہلواتا تھا۔

اِس ساری تمہید کا مقصد یہ ہے کہ اصل تاریخی پسِ منظر کو واضح کر دیا جائے، جس کی نقشہ کشی میں ملحد مصنف نے یا تو دانستہ ڈنڈی ماری ہے، یا پھر بے چارے کے پاس علم نہیں اور وہ "چھاپہ مار" واقع ہوا ہے۔ لیکن یاد رکھیے گا کہ "نقل کے لیے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے!" بہر حال دونوں صورتوں میں ملحد معترض اِس قابل قرار نہیں پاتا کہ اُس کو سنجیدگی سے لیا جائے۔

اب ہم اپنے اصل مؤقف کی طرف آتے ہیں۔ کیتھولک مسیحیت نہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی "پاکیزہ کنواری پیدائش" کی قائل ہے، بلکہ اُن کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ حضرت مریم کی پیدائش بھی میاں بیوی کے جنسی اختلاط کے بغیر ہوئی تھی، یعنی کنواری مریم بھی اپنی بیدائش میں انسانی جنسیت کے داغ سے پاکیزہ ہیں۔ یہ عقیدہ تیسری صدی عیسوی تک پروان چڑھ چکا تھا، جبکہ اِس سے پہلے بھی اِس کے ہلکے پھلکے حوالہ جات ملتے ہیں۔ یہی وہ عقیدہ تھا جو آگے چل کر کیتھولک دُنیا کے معروف ترین عقیدہ "چونکہ مریم تھی خدا کی ماں، لہٰذا از خود خدا (Mariology) "کی منطق پر قائم کردہ عقیدہ میں تشکیل پا گیا۔ اِس عقیدہ کو کیتھولک مذہب میں "خدا کو پیدا کرنے والی (Mother of God) "کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے اور اِس کے لیے جو یونانی مذہبی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے وہ Θεοτόκος یعنی Theo-Tokos ہے۔ Theo یونانی زُبان میں "خدا" کو کہتے ہیں، جبکہ Tokos ماخذ یا جنم دینے والے ذریعہ کو کہتے ہیں۔ اِس عقیدہ کے لیے علمی جواز یہ فراہم کیا جاتا ہے کہ خدا کو خدا کے ہی کسی رُوپ کے علاوہ کوئی اور جنم نہیں دے سکتا۔ یہ عقیدہ آج بھی مسیحیت کے 60 ٪ سے زائد ماننے والوں کے عقائد کا حصہ ہے اور وہ سب حضرت مریم کو ذاتِ خدا کا حصہ اور شفاعت و نجاتِ انسانی کا اہم جزو تسلیم کرتے ہیں۔ اِس روایت کی ابتداء شام میں ہوئی تھی۔

قرآنِ کریم نے اپنے نزول کے وقت مسیحی مذہب کی اسی اجتماعی صورتحال پر تبصرہ کیا ہے، کیونکہ اُس وقت حضرت مریم کی پوجا و پرستش آج کی نسبت زیادہ شدت سے ہوتی تھی، اور اِس کے لیے شام و ایشیائے کوچک اور بحیرہء روم کے مشرقی ساحل خاص طور پر شہرت رکھتے تھے۔ قرآن نے اِس صورتحال پر ایک عمومی انداز اختیار کرتے ہوئے اللہ کے علاوہ پرستش کی جانے والی معروف مسیحی ہستیوں کا ذکر کیا ہے اور جس انداز میں حضرت عیسیٰؑ کے الفاظ پیش کیے گئے ہیں وہاں "اللہ کے علاوہ مجھے (عیسیٰؑ) اور میری ماں (مریمؑ) کو خدا" جیسی ترکیب استعمال کی گئی ہے، جو انتہائی معقول ہے۔ اِس امر کی تصدیق کے لیے تاریخ کی شہادت موجود ہے کہ یہ دو ہستیاں حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم ہی تھیں، جن کی باقاعدہ بُت پرستانہ انداز میں عبادت کی جاتی تھی، کیونکہ اِس طرح مسیحیوں کے نزدیک اُن کے الوہیت کے درجہ کا بہترین اظہار ہوتا تھا۔ اِن کی پوجا نہ صرف اُس زمانہ میں کیتھولک مسیحیت میں پاپائیت (Papacy) کے زیرِ سایہ سرکاری طور پر کی جاتی رہی، بلکہ یہ سلسلہ آج بھی دُنیا بھر میں جاری ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جو لوگ اِس آیتِ مبارکہ سے "تثلیث" اخذ کرتے ہیں وہ اس بات پر غور ہی نہیں کرپاتے کہ سورۃ مائدہ کی مذکورہ آیت میں "تثلیث" لفظ کا ذکر تک موجود نہیں ہے، لہٰذا آیت حضرت مریمؑ کی شخصیت کی پوجا پر ایک عمومی تبصرہ ہے جو تثلیث سے آزاد اپنی تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔

آیئے اِس آیتِ مبارکہ پر ایک نظر دوبارہ ڈالتے ہیں۔

"جب اللہ فرمائے گا کہ اے عیسیٰ بن مریم! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کے سوا مجھے اور میری ماں کو بھی معبود مقرر کرو؟" (سورۃ مائدہ، 116(

تثلیث کا ذکر درحقیقت ایک دوسری آیتِ مبارکہ میں کیا گیا ہے اور یہاں حضرت مریم کا تذکرہ سِرے سے موجود ہی نہیں ہے۔

"بے شک کافر ہیں وہ لوگ جنھوں نے کہا کہ اللہ تین خداؤں میں تیسرا ہے۔" (سورۃ مائدہ، 73(

چونکہ یہاں حضرت مریم کا ذکر نہیں کیا گیا، تو الہامی صحائف کے عمومی اصولِ تفسیر، جس کا اطلاق بائبل مقدس پر بھی ہوتا ہے، کی رُو سے یہ سمجھنا کہ مریم ہی کو یہاں بھی اللہ اور عیسیٰ یعنی باپ اور بیٹا کے ساتھ تیسرا "خداوند" قرار دیا جا رہا ہے، ایک غلط سمت میں سوچ کے گھوڑے دوڑا کر افسانے گھڑنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا یہاں قیاس کا حقیقی تصورِ تثلیث کی طرف جانا ہی فی النفسِ معاملہ ایک مسلمہ اصول قرار پاتا ہے۔

اِسی طرح یہاں یہ معلوم کرنا بھی از حد ضروری ہے کہ مسیحی تثلیث کا تیسرا جزو کس ہستی کو مانتے ہیں۔ مسیحیت چوتھی صدی کے بعد سے کلیسیاء کی باقاعدہ سند کے ساتھ اجتماعی طور پر "رُوح القدس" کو تثلیث کا تیسرا جزو قرار دیتی ہے۔ تاہم یہ امر دلچسپی کا حامل ہے کہ رُوح القدس ایک مجرد عقیدہ، فلسفہ یا چیز ہے، جس کی کوئی

جسمانی یا کنکریٹ تشریح نہیں کی جاسکتی۔ للذا رُوح القدس کی منظّم پُوجا کیا جانا ممکن ہی نہیں تھا۔ نہ تو یہ بات بُت پرستوں کو اپیل کر سکتی تھی اور نہ ہی مسیحی لوگ کلیسیاء کے علاوہ کوئی ایسا معبد بنا سکتے تھے جو رُوح القدس کے نام منسوب ہو اور جہاں خدا باپ اور خدا بیٹے کے علاوہ کسی تیسرے کی عبادت کی جاسکے۔ مسیحی زیادہ سے زیادہ یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہمارا جسم رُوح القدس کا معبد/ ٹیمپل ہے۔ اِس لیے اِس تجرد پر ایک عام ذہن کا ٹِک پانا نہ اُس زمانے میں ممکن تھا اور نہ ہی آج ایسا ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسیحیت کے پینٹی کاسٹل فرقہ کے علاوہ آج بھی رُوح القدس کا تذکرہ مسیحی حلقوں اور کلیساؤں میں خال خال ہی ہوتا ہے۔ للذا قرآن نے زمینی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے نہ صرف مسیحیت کی ایک حقیقی تصویر کشی کی بلکہ ساتھ ہی ساتھ ایک ہی وار سے "شرک" کی اِس عجیب و غریب یونانی دیومالائیت سے ماخوذ شکل کو بھی مسترد کر دیا۔ یاد رہے کہ قرآنِ کریم نے "جبرائیل" کو رُوح القدس قرار دیا ہے، جو کہ مخلوقِ الٰہی میں سے ایک ہیں۔

بات ختم کرنے سے پہلے ملحد مصنف کی ایک اور مضحکہ خیز حرکت کا ذکر کر دیا جانا ایک علمی لطیفہ سے کم نہ ہو گا۔ مذکورہ بالا عبارت جو ملحد معترض کے اعتراضات کی حامل ہے، میں ایک جگہ عہد نامہ قدیم یعنی یہودی "تناخ" کا ذکر کرتے ہوئے مسیحیوں کے خدا کی جو تعریف مصنف نے کی ہے اُس کو تو مسیحی خود بھی تسلیم نہیں کرتے۔ یہاں تو ملحد صاحب مسلمانوں سے بھی زیادہ "مواحد" معلوم ہوتے ہیں، جو مسیحیوں کو "خدائے واحد" کا پرچار عہدِ قدیم سے کر کے یہ درس دے رہے ہیں کہ بھئی جس خدا کو تم تین کہہ کر مان رہے ہو، وہ تو درحقیقت بائبل مقدس کی کتابِ استثناء کی رُو سے "واحد" ہے اور اُس کا کوئی ہمسر نہیں۔ واہ رے ملحد، خدا نے تمہارے ہاتھ سے ہی توحید کا کیسا خوبصورت اقرار کروادیا اور وہ جملہ لکھوادیا جو تم اپنے طور پر وجودِ خدا اور کلامِ خدا کے خلاف لکھنا چاہ رہے تھے۔

تحریر سید وقاص حیدر

بائبل کے دفاع میں ملحدین کے دلائل

موجودہ بائبل تحریف شدہ ہیں اور اس میں تحریف ایک ایسی مسلمہ حقیقت ہے کہ عیسائی علما بھی اس کا انکار نہیں کر سکتے. بائبل شاید دنیا کی واحد کتاب ہے جس پر اتنی بار نظر ثانی ہو چکی ہے کہ جس کی نظیر کسی بھی الہامی کتاب کے لئے نہیں ملتی, عجیب بات یہ ہے کہ یہاں عیسائی نہیں بلکہ اک ملحد نے اپنی قرآن کے خلاف لکھی تحریر میں اسی قرآن ہی سے بائبل کے غیر محرف ہونے پر دلائل دیے ہیں. بائبل میں تحریف کوئی ایسی بات نہیں کہ جس کے بارے میں ہم یہ کہہ سکیں کہ ان ملحدین کو اس کے بارے میں علم نہیں ہے، انکی یہ چشم پوشی بے مقصد معلوم نہیں ہوتی.

ملحد کے بائبل کے دفاع میں پیش کیے گئے دلائل کا مختصر جائزہ

ملحد لکھتا ہے:

سورۃ انعام زمانۂ آخر کی مکی سورتوں میں سے ہے لیکن اگر غور سے اس سورۃ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ آیت 91 کا اضافہ ضرور بالضرور مدینہ میں ہی انجام دیا گیا۔ پہلے اس آیت پر ایک نظر ڈال لیتے ہیں جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے :

"اور ان لوگوں نے خدا کی قدر جیسی جاننی چاہیے تھی، نہ جانی۔ جب انھوں نے کہا کہ خدا نے انسان پر (وحی اور کتاب وغیرہ) کچھ بھی نازل نہیں کیا۔ کہو جو کتاب موسیٰ لے کر آئے تھے، اسے کس نے نازل کیا تھا جو لوگوں کے لیے نور اور ہدایت تھی اور جسے تم نے علیحدہ علیحدہ اوراق (پر نقل) کر رکھا ہے، ان (کے کچھ حصے) کو تو ظاہر کرتے ہو اور اکثر کو چھپاتے ہو۔ اور تم کو وہ باتیں سکھائی گئیں جن کو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمھارے باپ دادا۔ کہہ دو (اس کتاب کو) خدا ہی نے (نازل کیا تھا) پھر ان کو چھوڑ دیا کہ اپنی بیہودہ بکواس میں کھیلتے رہیں۔"

مندرجہ بالا آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد نے توریت پر تحریف کا الزام نہیں لگایا بلکہ کچھ آیات کے "چھپانے" کا ذکر کیا ہے۔ محمد کا مطلب صاف ہے کہ یہودی تورات کی تفسیریں غلط پیش کرتے ہیں تاکہ انھیں جھٹلا دیں اور ان کے دعووں کو مسترد کر دیں۔ ممکن ہے کہ جس طرح قرآن کی ہزاروں تفسیریں پیش کی جاتی رہی ہیں اور ہر تفسیر دوسری تفسیر سے علاحدہ ہوتی ہے، اسی طرح یہود بھی توریت کی تفسیریں پیش کرتے رہے ہوں۔ لیکن تفسیروں کی بنیاد پر جس طرح قرآن کو تحریف شدہ قرار نہیں دیا جا سکتا، اسی طرح توریت کو تحریف شدہ قرار دینا غلط ہوگا۔ سورۃ بقرہ، سورۃ آل عمران، سورۃ المائدہ وغیرہ کی بھی کچھ آیات کو ہمارے علما جواز کی شکل میں پیش کرتے ہیں کہ توریت میں تحریف ہوئی ہے لیکن چونکہ مجھے ڈر ہے کہ میں نفس موضوع سے کہیں دور نکل نہ جاؤں، لہٰذا یہاں ان آیات پر تفصیلی رائے پیش کرنے کی گنجائش نہیں پاتا لیکن ان تمام آیات میں جو مدنی ہیں، کہیں بھی کھلم کھلا یہ نہیں کہا گیا کہ تورات میں تحریف ہوئی ہے بلکہ یہ دعویٰ الفاظ کے ہیر پھیر کے ساتھ کیا گیا ہے کہ یہودی انھیں اس لیے چھپاتے ہیں تاکہ محمد کے منصب رسالت کی بشارت کی تصدیق نہ ہو سکے۔

تبصرہ:

قرآن مجید نے یہودیوں کی تحریف کرنے کے ہر انداز کو بیان فرمایا ہے۔ چاہے وہ لفظی تحریف ہو یا معنوی یا پھر تحذیف۔ لفظی تحریف تو تورات میں جا بجا ہے جس کی گواہی گذشتہ صدی میں وادی قمران سے دریافت ہونے والی دو ہزار قدیم صحف بھی دے رہے ہیں کہ مروجہ تورات کا عبرانی متن اور اس قدیم متن میں بعد المشرقین ہے حتیٰ کہ محققین کو اقرار کرنا پڑا کہ قمرانی صحائف ہمیں اس دور میں لے جاتے ہیں کہ مروجہ متن کی حیثیت پر شک ہونے لگتا ہے۔ (بحوالہ معتدبہ کلام مقدس) دوسری بات یہ کہ یہودیوں کے مطابق تورات موسیٰ علیہ السلام نے لکھی تو کیا تورات کی کتاب استثناء کے آخری باب میں موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا حال بھی موسیٰ علیہ السلام نے کیا قبر سے اٹھ کر لکھا؟؟ یہ تحریف نہیں تو پھر اور کیا ہے؟

ملحد لکھتا ہے:

مجھے پورے قرآن میں کہیں بھی ایک ایسی آیت نہیں ملی جس میں یہ واضح طور پر کہا گیا ہو کہ توریت میں کوئی تحریف یا تبدیلی کی گئی ہو بلکہ اس کے برخلاف سورۃ المائدہ (آیت نمبر 44) میں توریت کی صحت پر اصرار کیا گیا ہے، "بے شک ہم نے توریت نازل فرمائی جس میں ہدایت اور روشنی ہے، اسی کے مطابق انبیا جو (خدا کے) فرماں بردار تھے یہودیوں کو حکم دیتے رہے ہیں اور مشائخ اور علما بھی کیوں کہ وہ کتاب خدا کے نگہبان مقرر کیے گئے تھے اور اس پر گواہ تھے (یعنی حکم الٰہی کا یقین رکھتے

تھے) تو تم لوگوں سے مت ڈرنا اور مجھی سے ڈرتے رہنا اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑی سے قیمت نہ لینا اور جو خدا کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں۔ "

تبصرہ:

مروجہ تورات میں جس قدر تحریفات موجود ہیں اس پر پورے دفاتر لکھے جا سکتے ہیں ایک مثال تو ہم نے اوپر ہی دے دی ہے کہ تورات میں موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا حال کس نے لکھا؟ دوسری بات یہ کہ قرآن مجید صاف صاف کہتا ہے کہ یہ یہودی و نصاری اپنے ہاتھ سے کتاب لکھ کر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اور مروجہ بائبل میں شامل تمام کتب اسی صفت سے متصف ہیں کیونکہ ان کے مصنف ہی گمنام ہیں جس کا اقرار یہودی و مسیحی دونوں کے ہی علماء کو ہے بائبل میں شامل کتب کا فقط انبیاء کرام علیہم السلام کی طرف انتساب ہے اور انتساب ہونے سے ہر گز یہ انہی بر گزیدہ انبیاء کی تحاریر نہیں بن سکتی ہیں۔

ملحد لکھتا ہے:

مذکورہ بالا آیت سے ظاہر ہے کہ اگر توریت کی تحریف و تنسیخ ہو جاتی تو قرآن اسے ہر گز صحیح اور قابل قبول نہ گردانتا۔ پھر وہ اسی آیت میں توریت کی نگہبانی کا بھی ذکر کر رہا ہے۔ چنانچہ جو مسلمان توریت کی تحریف و تنسیخ کی بات کرتے ہیں دراصل وہ خود قرآن کی توہین و تکذیب کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یعنی اگر قرآن نے توریت کی حفاظت و نگہبانی کا دعویٰ کیا تو وہ محض دعویٰ تھا۔

تبصرہ:

قرآن نے کہیں یہ دعوی نہیں کیا پرانی کتابیں محفوظ ہیں، قرآن مجید نے اُن کتب کو نور وہدایت کہا جو موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام پر نازل ہوئی تھیں جبکہ یہودی موسیٰ علیہ السلام اور عیسائی عیسیٰ علیہ السلام پر کتاب نازل ہونے کے منکر ہیں اور مروجہ تورات اور انجیل موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کے بہت بعد میں لکھی گئی ہیں لہٰذا قرآن مجید نے ان جعلی کتابوں کو محرف اور اصلی کتابوں کو نور اور ہدایت کہا ہے۔ ان کتابوں میں مذکور ان واقعات اور مسائل کو جنکی تفصیل میں تحریف کر لی گئی تھی، دوبارہ ٹھیک تفصیل کے ساتھ قرآن میں بیان کیا گیا۔

ملحد لکھتا ہے:

اصل بات یہ ہے کہ محمد کو خود توریت کی صحت پر کسی قسم کا کوئی شک و شبہ نہیں تھا لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ اب یہودیوں سے کوئی غرض و مطلب نہیں تو یہی بہتر سمجھا کہ اس کو غیر معتبر قرار دے دیں، حتیٰ کہ قبلہ بھی یروشلم سے مکہ منتقل کر دیا۔ پھر شروع ہوا محمد کے منتقمانہ مزاج کی گھڑ دوڑ نے مدینہ کے تینوں یہودی قبیلے یعنی بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریضہ کو روند ڈالا، ان کے قلعوں اور زراعتی فارموں پر قبضہ کر لیا، ان کے مردوں کو قتل کر دیا، ان کے بچوں اور عورتوں کو غلاموں کے بازار میں بیچ دیا گیا۔ محمد نے ان کی کچھ عورتوں کو اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیا اور ریحانہ نام کی خوب صورت دوشیزہ کو اپنے لیے منتخب کر لیا لیکن ریحانہ نے جب محمد سے نکاح کرنے سے انکار کر دیا تو محسن انسانیت نے اسے بغیر نکاح کے ہی اپنے حرم میں ڈال لیا۔

تبصرہ:

تاریخ سے یہ واضح ہے کہ یہودی اپنی شریر فطرت کی وجہ سے ان سزاؤں کے حقدار بنے ورنہ پیغمبر اسلام ﷺ تو ان کی شرارتوں کو نظرانداز کرتے رہے مگر یہ سرکش اپنی شرارتوں میں حد سے متجاوز ہوگئے تو تبھی ان کو از روئے تورات دھوکہ دہی کی سزا دی گئی اور ملک بدر کر دیا گیا۔ یہ سزا پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی طرف سے نہیں دی بلکہ تورات کی رو سے ان کی یہی سزا بنتی تھی جیساکہ انہوں نے خدا کے ساتھ دھوکہ کیا تو خدا نے چالیس سال تک ان کو وادی سینا میں دربدر رکھا اسی طرح ان کو سزا دی گئی۔ اب جہاں تک مدینہ کے یہودیوں کو قتل کرنے کا معاملہ ہے تو یہودیوں نے اپنا فیصل اپنے فقیہ، سردار اور شریعت کے عالم حضرت سعد کو مقرر کیا تھا کہ وہ جو ہمارے متعلق فیصلہ کریں گے وہ ہمیں قبول ہوگا اور سعد رضی اللہ عنہ کے فیصلے کے مطابق وہ قتل کئے گئے تو قتل کی سزا تو خود انہوں نے ہی منتخب کی۔ یہ

سز بھی انکی کتاب کے مطابق تھی۔ نیز اس قتل میں بھی عورتوں بچوں اور بوڑھوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا اور جہاں تک باندی والا قصہ ہے تو یہ سب بلاسند بکواس اور افتراء ہے۔

ملحد لکھتا ہے:

توریت کی تحریف و تنسیخ کی رد میں آخری دلیل یہ پیش کی جاسکتی ہے کہ قرآن کا دعویٰ کسی دوسری کتاب کے لیے حجت تسلیم نہیں کیا جاسکتا چونکہ وہ خود آسمانی کتاب ہونے کا مدعی ہے لہٰذا ایک مدعی اپنا گواہ نہیں ہو سکتا۔ کیا مسلمانوں کے پاس وہ توریت موجود ہے جس سے اس توریت کا موازنہ کیا جاسکے جس کے بارے میں ان کا دعویٰ ہے کہ وہ تحریف شدہ ہے؟

تبصرہ:

مروجہ تورات کے متعلق تو یہودی بھی اقرار کرتے ہیں کہ اس کی گواہی اتنی بھی معتبر نہیں کہ اسے کسی عدالت میں بطور شہادت پیش کیا جاسکے۔ (بحوالہ مقدمہ تناخ، جیوش پبلیکیشن سوسائٹی فلاڈفلیا) تو جب یہودی ہی اس کی حیثیت کو نہیں مانتے تو قرآن کیسے مان سکتا ہے؟ دوسری بات یہ کہ تورات یہودیوں کو دی گئی نہ کہ مسلمانوں کو۔ جب اہلیان تورات ہی تورات کی حفاظت نہ کر سکے تو مسلمانوں سے تورات کی حوالگی کا مطالبہ کرنے کٹ حجتی، ہٹ دھرمی اور جہالت کے سوا کچھ نہیں۔

دوغلا پن ملاحظہ فرمائیے

ایک طرف ملحد قرآن سے بائبل کے غیر محرف ہونے کو اس دلیل سے ثابت کر رہا ہے کہ

" مجھے پورے قرآن میں کہیں بھی ایک ایسی آیت نہیں ملی جس میں یہ واضح طور پر کہا گیا ہو کہ توریت میں کوئی تحریف یا تبدیلی کی گئی ہو بلکہ اس کے برخلاف سورۃ المائدہ (آیت نمبر 44) میں توریت کی صحت پر اصرار کیا گیا ہے"

دوسری طرف اسے اسی قرآن کے انسانی کلام ہونے پر بھی اصرار ہے۔۔!!

یہاں یہ سوال بھی اٹھایا جاسکتا ہے کہ ایک ملحد تورات کے غیر منحرف ہونے کے بن مانگے دلائل کیوں پیش کر رہا ہے؟؟؟؟؟

اسکی ایک وجہ یہ ہے کہ ملحد کی تحریر ایک عیسائی مستشرق کی مہربانی کا نتیجہ ہے، جب عیسائی مصنف نے قرآن کے خلاف پراپیگنڈے میں اتنی مہربانی کی ہے تو ملحد کا بھی یہ فرض بنتا ہے کہ تھوڑی رعایت کرتے ہوئے اس نے جو اپنی کتاب بائبل کا دفاع کیا ہوا ہے وہ بھی پیش کر دیا جائے۔۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس سے ملحدین کی صفوں میں موجود عیسائی جو اسلام کے خلاف ملحدین کے شانہ بشانہ کام کر رہے ہیں جنکی وجہ سے کوئی ملحد عیسائیت کے خلاف بولنے کی جرات نہیں کرتا' وہ بھی خوش ہو جائیں گے۔ الکفر ملۃ الواحدہ

تبصرہ: عبداللہ غازی

تحریف بائبل-عہد نامہ جدید تاریخ کے آئینے میں

بائبل مقدس مسیحی دنیا کے لئے خدا کا ناقابل تغیر کلام ہے۔۔ مسیحی علماء کے مطابق یہ دعوی بنی اسرائیل/یہودیوں کی تاریخ وحی کے اندر اپنی جڑیں رکھتا ہے، لہٰذا یہ دلیل بحیثیت ثبوت تاریخی طور پر ناقابل مواخذہ ہے!

تاہم، تاریخ کا مطالعہ کرنے پر ہمیں کچھ ایسے حقائق سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے، جو عیسائی دعوی کے خلاف جاتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔۔ بائیبل مقدس کی انگریزی اور دنیا کی دیگر زبانوں میں ترجمے (Translation Process) کی داستان بہت عجیب مگر دلچسپی سے بھرپور ہے۔۔ دنیا بھر کی زبانوں میں ہونے والے "بائبلی تراجم" کی بنیاد عصر حاضر کے انگریزی ترجمہ ورژن (English Versions) ہیں، جن کو دیگر اقوام بطور "سند (Certified Text) "استعمال کرتی ہیں اوران پر اندھا اعتماد رکھ کر وہ اپنی اپنی زبانوں میں بائبل کے ترجمہ کا کام کر رہے ہیں۔۔ مثال کے طور پر بائبل کے ایک اہم "اُردُو ترجمہ" کی بنیاد انگریزی زبان کا 1978ء میں شائع ہونے والا "نیو انٹر نیشنل ورژن (NIV) "ہے۔اِس سے ایک چیز واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ بائبل کے 99 %تراجم در حقیقت کسی "ترجمے کا ہی ترجمہ" ہیں، جبکہ دنیا کی کسی بھی معتبر زبان میں پائے جانے والے ترجمے اور بائبل کے عہد نامہ ہائے جدید وقدیم (New & Old Testaments) کے اصل متن کے مابین کوئی براہ راست تعلق اور ربط ضبط موجود نہیں ہے۔

حیرت انگیز امر یہ ہے کہ جن مختلف یونانی "متون/مخطوطات (Greek Manuscripts) "پر آج تک کیے جانے والے انگریزی تراجم کی بنیاد استوار ہے، وہ بھی کم از کم "چار" (4) بنیادی قسموں میں منقسم ہیں۔۔ لہٰذا ہم بادلیل کہہ سکتے ہیں کہ آج کم از کم "چار عدد عہد نامہ جدید" مسیحی دنیا میں موجود ہیں، جو کہ اصل ہونے کے دعویدار ہیں۔۔ تاہم ان میں سے کسی کے متعلق بھی سو فیصد (100 %) یقین سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ہی اصل عہد نامہ جدید ہے۔۔اِس پر مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ آج تک دریافت ہونے والے 14 ہزار سے زائد قدیم مخطوطات میں سے کوئی ایک مخطوطہ یا متن بھی مکمل شکل میں دستیاب نہیں ہے۔۔مزید برآں، اس سے بڑھ کر دلچسپ امر یہ ہے کہ ان ہزاروں مخطوطات میں سے کوئی سے دو نسخے بھی باہم مشابہت نہیں رکھتے۔۔

آج مسیحی دنیا کے پاس سب سے قدیم نسخہ "کوڈکس ویٹیکانس (Codex Vaticanus) " ہے، جو 310ء سے 325ء کے لگ بھگ کہیں لکھا گیا۔۔ دوسرا قدیم ترین واہم ترین نسخہ "کوڈکس سینائٹیکس (Codex Sinaiticus) "ہے، جو کہ 375ء یا اس کے بعد تحریر کر کے صحیفے (Codex) کی شکل میں تشکیل دیا گیا۔ جبکہ تیسرا قدیم ترین یونانی نسخہ "کوڈکس الیگزینڈرینوس (Codex Alexandrinus) "کہلواتا ہے، جس کے لکھے جانے کا زمانہ پانچویں صدی عیسوی ہے۔۔ مسیحیت کے پاس تصدیق عہد جدید کے لئے فخر کئے جانے کے قابل کل اثاثہ یہی 3 قدیم نسخے ہیں۔۔ تاہم یہ سب نسخے عہد جدید کے لکھے جانے کے اصل زمانہ سے کم از کم 2 سے 4 صدیاں بعُد کی پیداوار ہیں اور اصل متن کی نمائندگی نہیں کرتے۔۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی نسخہ مکمل عہد نامہ جدید یعنی موجود 27 کتابیں اپنے اندر نہیں رکھتا۔۔ دوسرے لفظوں میں، عیسائی "صحیفائی قانون (Scriptural Canon) " کی توثیق بھی ان مسودات سے کسی طور ممکن نہیں ہے! مزید برآں، مسیحی فاضلین تسلیم کرتے ہیں کہ ان مسودات میں کثرت سے "کاتبین کی غلطیاں" اور بعد کی " تحریفات واضافہ جات (Scribal Errors & interpolations) " موجود ہیں، جن کی ایک لمبی فہرست اضافوں کے ساتھ فاضل مغربی مسیحی علماء متعدد بار شائع بھی کر چکے ہیں۔ ان میں سے اکثر تحقیقی نتائج پر مشتمل شائع ہونے والی کتابوں کے حقوق "United Bible Society" کے ہاتھ میں ہیں۔۔

ان نسخوں کی بنیاد پر "عہد نامہ جدید" کے جو 4 اہم یونانی ورژن (Greek Versions) یونانی متن کی تعمیر نو کے بعد تخلیق کئے گئے ہیں، وہ یہ ہیں:

1۔"ویسٹکاٹ اینڈ ہورٹ -- (Westcott & Hort) "انیسویں صدی عیسوی!

2۔"نیسلے-الاند -- (Nestle-Aland) "انیسویں صدی عیسوی !

3۔ UBS " گریک نیو ٹیسٹامنٹ -- (United Bible Society Greek New Testament) " بیسویں صدی عیسوی !

)آج کے جدید ترین بائبلی ورژن، مثلاً نیو انٹر نیشنل ورژن (NIV) ، نیو امریکن اسٹینڈرڈ ورژن (NASB) ، ریوائزڈ اسٹینڈرڈ ورژن (RSV) ، امریکن ریکوری ورژن (ARV) وغیرہ انہی 3 مختلف المتن یونانی متنوں پر مبنی انگریزی تراجم ہیں۔(

4۔"ٹیکٹوس ریسپٹوس (Textus Receptus) " ۔

1881ء میں شائع ہونے والے بائبل کے "ریوائزڈ ورژن (Revised Version) " نے "ویسٹکاٹ اینڈ ہورٹ" کے متن کو کام میں لاتے ہوئے زمانہ قدیم میں "مقدس گائے" سمجھی جانے والی "کنگ جیمس ورژن بائیبل (KJV) " کی قانونی ومذہبی حیثیت کو چیلنج کر دیا تھا۔
"کنگ جیمس ورژن بائبل" (1611ء) کا انگریزی ترجمہ سولہویں صدی عیسوی میں کیتھولک چرچ کے تحت تشکیل دیئے گئے یونانی متن "ٹیکسٹوس ریسپٹوس" پر استوار کیا گیا تھا۔
"ٹیکٹوس ریسپٹوس" کیتھولک اِسکالر "اراسمس (Desiderius Erasmus) "کا تیار کیا ہوا متن تھا، جو اس نے "سینٹ جیروم (Saint Jerome) "کے مشہور زمانہ لاطینی ترجمہ "وولگاتا (Vulgate) "اور کچھ یونانی مسودات کی مدد سے تیار کیا تھا۔ یاد رہے کہ تشکیل متن کے دوران کئی ایک مقامات پر "اراسمس" نے یونانی مسودات میں عہد نامہ جدید کی کسی غیر دستیاب (Missing) آیت کو رائج الوقت لاطینی متن سے اٹھا کر واپس یونانی میں ترجمہ کر دیا اور اسکو عہد نامہ جدید کا اصلی متن قرار دے دیا۔ مثال کے طور پر، کتاب مکاشفہ (Revelation) کی آخری 8 آیات (باب 22، آیات 13 تا 21)، 1 یوحنا 5 : 7-8 (باب 5، آیات 7 تا 8) وغیرہ اسی زمرے میں آتی ہیں۔ مزید حیران کن امر یہ ہے کہ اِس سے قبل کم از کم پورے ایک ہزار سال تک مسیحی دنیا کے پاس عہد نامہ جدید کا کوئی باقاعدہ "متفق الآراء" یونانی متن سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ اس لئے کیتھولک چرچ نے سینٹ جیروم کے "وولگاتا (Latin Vulgate) " کو ہی "خدا کے الہامی کلام" کا درجہ دے رکھا تھا، جس کی یہ حیثیت کسی نہ کسی طور آج بھی برقرار ہے!
بازنطینی سلطنت کی سرکاری زبان لاطینی میں بائبل کے ترجمے کے اس منصوبے کی شروعات سینٹ جیروم کی نگرانی میں 382 عیسوی میں ہوئی اور یہ منصوبہ 405ء میں مکمل ہوا۔ اس ترجمہ کو لاطینی زبان میں "Vulgate" یعنی "روزمرہ عام فہم زبان" کا نام دیا گیا۔ جیروم کے "Latin Vulgate" پر مبنی انگریزی زبان میں کیا گیا ترجمہ "Douay-Rheims English Bible" کہلاتا ہے، جو کہ صرف "کیتھولک عیسائیوں" کے ہاں استعمال کیا جاتا ہے۔
مسیحی دنیا میں آج بھی یہ تنازعہ بڑی شدت کے ساتھ موجود ہے کہ یونانی زبان میں موجود عہد نامہ جدید کے ان چاروں ورژنز میں سے اصلی "مسیحی عہد نامہ" کے قریب ترین کون سا ہے؟ لیکن اِس بات کا کسی کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ البتہ مسیحی اسکالرز متن کی تعمیر نو (Reconstruction) کرتے ہوئے اسے اے (A)، بی (B)، سی (C)، ڈی (D)، ای (E)، اور ایف (F) کے درجوں میں تقسیم کرتے ہیں، جس کا مطلب مندرجہ ذیل ہے:

- اے" سے مراد وہ متن ہے جو ہر طرح سے تصدیق شدہ ہے۔
- بی" سے مراد وہ متن ہے اکثریت سے تصدیق شدہ ہے۔
- سی" سے مراد وہ متن ہے جو کافی مخطوطات میں موجود ہو۔
- ڈی" سے مراد وہ متن ہے جو بہت کم نسخوں میں پایا گیا ہو۔
- ای" سے مراد وہ متن ہے جو ایک یا دو نسخوں میں موجود ہو، لیکن اس پر علماء کی پختہ رائے موجود ہو کہ یہ قابل اعتماد ہے۔
- ایف" سے مراد وہ متن ہے جو محض ایک نسخہ میں یا صرف بعد کے زمانہ کے مسودات میں پایا گیا ہو، اور متن کے نقاد ماہرین اسے 'ناقابل اعتماد' قرار دے چکے ہوں۔

مثال کے طور پر، انجیل مرقس کے 16 ویں باب کا طویل اختتام (آیات 9 تا 20) جس میں "یسوع مسیح کی حیات ثانیہ (Resurrection) "کا ذکر ہے، اسے متن کے ماہرین "ایف" کا درجہ دے کر مسترد کر چکے ہیں۔ لہٰذا بائیبل کے ہر جدید ورژن کے حاشیہ میں اِس بات کا ذکر ضرور موجود ہوتا ہے کہ یہ تحریر قدیم نسخوں میں نہیں پائی جاتی، لہٰذا یہ مشکوک ہے۔ اسی طرح ماہرین متن انجیل یوحنا کے 8 ویں باب میں موجود "بدکار عورت اور اس کی سزا" والے واقعہ (آیات 1 تا 11) کو بھی "ایف" کا درجہ دے چکے ہیں۔ اِس کے علاوہ بھی بائبل کے مسیحی عہد نامہ کے اندر کم از کم 22 ایسے مقامات موجود ہیں، جن کو خود مسیحی علماء کی طرف سے "ایف" کا درجہ مل چکا ہے اور اب ان کو علمی حلقوں میں مسترد کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "کنگ جیمس ورژن بائبل" اور بائبل کے دیگر جدید تراجم کے درمیان ضخامت اور مضامین کا واضح فرق موجود ہے!

لہٰذا، آخر میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ باقی ماندہ بائبل پر اب کس حد تک اعتماد کیا جائے اور ان مسائل کی واضح موجودگی میں آخر کیسے کیا جائے؟ مزید یہ کہ اِس شعبہ میں ہونے والی جدید علمی پیش رفت کے بعد کیا "قرآن کریم" کا یہ دعویٰ سچ ثابت نہیں ہو جاتا کہ یہودی اور مسیحی علماء اور کاتبین بلاشبہ الہامی کتابوں کے متن میں دانستہ و نادانستہ " تحریف" کرتے رہے ہیں؟

)واضح رہے کہ یہاں بحث محض "عہد نامہ جدید" تک محدود رکھی گئی ہے، جبکہ "عہد نامہ قدیم" کے بارے میں بحث علیحدہ مضمون میں کی جائے گی!(۔

نوٹ: مسیحی بھائیوں کے سامنے میدان کھلا ہے کہ وہ اِس تحریر میں پیش کیے گے حقائق کو ثبوت کی بنیاد پر اگر جھٹلا سکتے ہیں تو وہ ضرور ایسا کر دکھائیں... خوش آمدید!

تحریر سید وقاص حیدر

متفرق اعتراضات اور جوابات

مستشرق ٹسڈل کی کتاب کا اردو ترجمہ جو ملحدین نے پیش کیا اس کے تقریبا تمام بڑے اعتراضات /اشکالات کا ہم تفصیل سے مدلل جواب دے چکے ہیں۔ کچھ رہ جانے والے حوالوں پر علیحدہ سے تبصرہ پیش ہے۔

ملحد لکھتا ہے:

"اور بالفرض محال یہ مان بھی لیا جائے کہ محمد ناخواندہ تھے تو اس کا کیا یہ مطلب ہوا کہ ان کی سماعت بھی مصلوب تھی؟ کیا وہ یہودیوں اور عیسائیوں وغیرہ کی تعلیمات اور قصص، حکایت اور عقائد کے بارے میں دریافت بھی کرنے پر قادر نہیں تھے؟ جب کہ آپ کے علاقے میں بڑے بڑے یہودی قبائل سکونت پذیر تھے اور چپے چپے پر عیسائیوں کے معبد تھے اور راہبوں کی خانقاہیں موجود تھیں۔"

تضاد کا عالم یہ ہے کہ ملحد صاحب شروع میں ایک جگہ خود اپنے والد محترم (روحانی) ٹسڈل کی مذہبی کتاب بائبل میں تحریف ہونے کے خلاف دلائل دیتے ہوئے لکھتے ہیں ۔ یہود اپنی کتاب کو محمد ﷺ سے چھپاتے تھے "ان تمام آیات میں جو مدنی ہیں، کہیں بھی کھلم کھلا یہ نہیں کہا گیا کہ تورات میں تحریف ہوئی ہے بلکہ یہ دعویٰ الفاظ کے ہیر پھیر کے ساتھ کیا گیا ہے کہ یہودی انھیں اس لیے چھپاتے ہیں تاکہ محمد کے منصب رسالت کی بشارت کی تصدیق نہ ہو سکے۔" اور یہاں ملحد صاحب اسی بات کو اپنی دلیل بنا رہے ہیں کہ چپے چپے عیسائی اور یہودی راہبوں کی خانقاہیں موجود تھیں۔

آگے لکھتا ہے:

"بلکہ میرا دعویٰ ہے کہ محمد پڑھ بھی سکتے تھے اور لکھ بھی سکتے تھے۔ صلح حدیبیہ کا قصہ مشہور ہے کہ محمد نے علی کے ہاتھ سے قلم لے کر خود "محمد رسول اللہ" میں سے "رسول اللہ" کو کاٹ دیا اور اس کی جگہ "ابن عبداللہ" لکھ دیا۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم دونوں نے صلح حدیبیہ کے بیان میں لکھی ہے۔ پھر زندگی کے آخری دنوں میں جب محمد بستر مرگ پر تھے تو ارشاد کیا کہ ایک دوات اور سفید کاغذ میرے پاس لاؤ۔ میں ایک وثیقہ اور کتاب تم کو لکھ دوں تاکہ میرے بعد تم گمراہ نہ ہو جاؤ۔ یہ حدیث شیعوں اور سنیوں کے مباحثوں میں کافی مشہور ہے۔ اس کو ابن عباس نے روایت کیا ہے اور بخاری و مسلم دونوں میں موجود ہے۔

تبصرہ:

صلح حدیبیہ والی حدیث میں نبی علیہ السلام سے رسول اللہ لکھا ہونے کا مٹانا تو مذکور ہے مگر ابن عبداللہ لکھ دینا کہیں مذکور نہیں یہ ملحد کا سفید جھوٹ ہے۔ ایک ان پڑھ شخص اتنے عرصے میں اپنے نام سے واقف ہو ہی جاتا ہے، ہم نے دیہاتوں میں کئی ایسے بابے دیکھے ہیں جنھوں نے کسی سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا لیکن وہ اپنا نام لکھ سکتے ہیں۔ جہاں تک واقعہ قرطاس والی حدیث کا تعلق ہے اس میں بھی لکھوانے کا ذکر ہے لکھنے کا ذکر نہیں یہاں بھی بے شرم ملحد نے جھوٹ بولا ہے۔ ملحد اپنی تفصیل ایک عیسائی مستشرق کی کتاب سے پیش کر رہا ہے اور عیسائیوں ہی کی کتاب میں اُمی نبی (ﷺ) کی آمد کی پیش گوئی موجود ہے۔

" پھر وہ کتاب اسے دین جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتا اور کہیں، اسے پڑھ اور وہ کہے میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔ (کتاب مقدس، یسعیاۃ: 12/29)

ملکہ سبا یعنی بلقیس اور سلیمان کی ملاقات :

ملحد لکھتا ہے

قرآن میں جو کچھ اس باب میں آیا ہے، اگر اس قصہ کو یہودیوں کی کتاب تارگوم ثانی استھر (Second Targum Esther) سے ملائیں تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اس افسانے کو بھی محمد نے یہودیوں سے محض سن کر پسند فرمایا اور یوں اس کو قرآن میں جگہ مل گئی۔ سورہ نمل میں اس قصہ کی تفصیل دیکھ ڈالیے، چیونٹیوں کا لشکر، اڑتے جانور اور ان کی گفتگو، ملکۂ سبا کو سجدہ، سلیمان کا اسے خط بھیجنا، تخت کا بیان، بلقیس کی پنڈلیوں کا ذکر وغیرہ سے کچھ تارگوم ثانی سے ماخوذ ہے۔ فرق صرف تخت کے بیان میں ہے لیکن بقیہ قصہ من و عن ہے، حتیٰ کہ نامہ بر پرندے بھی آپس میں مشابہت رکھتے ہیں۔ قرآن میں اس نامہ بر کو "ہدہد" کہا گیا ہے جب کہ تارگوم ثانی میں "چکور۔" اگر اس معمولی فرق سے کوئی یہ کہے کہ قرآن کا قصہ وحی پر مبنی ہے تو اس پر مسکرانے کے علاوہ کچھ نہیں کیا جا سکتا۔

تبصرہ:

پیغمبر اسلام نے یہودیوں سے کہاں سنا اسکا ثبوت ملحد صاحب کبھی پیش نہیں کر سکتا۔ اہلیان عرب میں یہودی رسائی مستند بدرجہ دوم مواد تک نہیں تھی یہ سب مواد تو آثار قدیمہ کی دریافت ہے اور مدت مدید تک یہودیوں اس سے نابلد رہے ہیں لہٰذا یہ بات بعید از قیاس ہے کہ یہ قصہ وہاں سے ماخوذ ہے۔ جب تک کہ اس کے ٹھوس ثبوت دستیاب نہ ہو جائیں کہ پیغمبر اسلام کی ان کتب تک رسائی تھی؟ دوسری بات یہ کہ قرآن مجید نے کہیں بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ پیغمبر اسلام کوئی نیا دین یا نئی تعلیمات لے کر آئے ہیں بلکہ اسلام تو سابقہ ادیان حق کا تسلسل ہے اگرچہ اسلام ان مذاہب میں پیدا ہو جانے والے خرافات کا رد کرتا ہے جو کہ وقت کے ساتھ ساتھ جاہل عوام میں رائج ہو گئی تھیں لہٰذا اس واقعہ کو تاریخ سے مسروق قرار دینا سوائے جہالت کے اور کچھ بھی نہیں۔ تیسری بات یہ کہ اگر یہ واقعہ تورات کی تواریخ سے ہی لیا گیا ہے تو پھر یہ اعتراض سب سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصرین یہودیوں کو کرنا چاہیے تھا اور وہ ہرگز جاہل نہیں تھے بلکہ ان میں عبداللہ بن سلام اور عمرو رضی اللہ عنہما جیسے یہودی فقہاء اور شرع کے عالم موجود تھے جو ملحدین کی طرح عقل سے پیدل اور جاہل ہرگز نہیں تھے۔ جب انہوں نے اس واقعہ کے مبینہ سرقہ پر کچھ نہیں کہا بلکہ پیغمبر اسلام پر ایمان لے آئے تو اب دو ہزار سال بعد عیسائی یا ملحد اٹھ کر جتنا بھی شور مچالیں اس سے اسلام قرآن اور صاحب قرآن کی صداقت پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔

قصہ ہاروت وماروت کا : معترض لکھتا ہے

"ماور ان (ہزلیات) کے پیچھے لگ گئے جو سلیمان کے عہد سلطنت میں شیاطین پڑھا کرتے تھے اور سلیمان نے مطلق کفر کی بات نہیں کی، بلکہ شیطان ہی کفر کرتے تھے کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ اور ان باتوں کے بھی (پیچھے لگ گئے) جو شہر بابل میں دو فرشتوں (یعنی) ہاروت اور ماروت پر اتری تھیں۔ اور وہ دونوں کسی کو کچھ نہیں سکھاتے تھے، جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو (ذریعۂ) آزمائش ہیں۔ تم کفر میں نہ پڑو۔ غرض لوگ ان سے (ایسا) جادو سیکھتے، جس سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں۔ اور خدا کے حکم کے سوا وہ اس (جادو) سے کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ اور کچھ ایسے (منتر) سیکھتے جو ان کو نقصان ہی پہنچاتے اور فائدہ کچھ نہ دیتے۔ اور وہ جانتے تھے کہ جو شخص ایسی چیزوں (یعنی سحر اور منتر وغیرہ) کا خریدار ہوگا، اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں۔ اور جس چیز کے عوض انھوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا، وہ بری تھی۔ کاش وہ (اس بات کو) جانتے۔" (سورہ بقرہ: 102)

اگرچہ قرآن کی محولہ بالا آیت میں ہاروت اور ماروت کا تعارف مل جاتا ہے لیکن تفسیروں میں ان کے تعلق سے کئی تفصیلات ملتی ہیں جو یہودیوں کی "تالمود" میں دو تین جگہ لکھا ہوا مل جاتا ہے۔ ان دونوں قصوں کو جب ہم آپس میں ملا کر دیکھتے تو صرف یہی فرق نظر آتا ہے کہ قرآن میں ان فرشتوں کو ہاروت اور ماروت کہا گیا ہے جب کہ مدراش میں شمخزی اور عزائیل۔

تبصرہ:

تالمود شریعت کی تشریح یعنی فقہ اور احکامات کی کتاب ہے قصہ کہانیوں کی نہیں۔ مزید جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا کہ اہلیان عرب میں یہودی رسائی مستند بدرجہ دوم مواد تک نہیں تھی یہ سب مواد تو آثار قدیمہ کی دریافت ہے اور مدت مدید تک یہودیوں اس سے نابلد رہے ہیں لہٰذا یہ بات بعید از قیاس ہے کہ یہ قصہ وہاں سے ماخوذ ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ہماری تحریر "قرآن، تورات اور انجیل کے قصے"

ملحد لکھتا ہے:

عبداللہ بن عمرو سے ایک حدیث روایت ہے کہ "نبی صلعم ہم لوگوں سے بنی اسرائیل کی حدیثیں بیان کرتے کرتے صبح کر دیتے تھے، جب تک انھیں نماز کا خیال نہ آ جاتا۔" اس حدیث سے واضح ہے کہ محمد یہود کے قصص اور افسانوں سے جو ان کے درمیان مروج تھے، اچھی طرح واقف ہو گئے تھے۔ اگر قرآن و حدیث کی تعلیمات کا ان قصص اور افسانوں سے موازنہ کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ان دونوں ایک پختہ اور یقینی رشتہ ہے۔ یہاں یہ عذر لنگ بیکار ہے کہ رسول ناخواندہ تھے، اس لیے وہ یہودیوں کی کتابیں نقل کرنا تو کجا پڑھ بھی نہیں سکتے تھے۔ عموماً اس کی شہادت سورۃ اعراف کی آیت 157 کے فقرے" الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ" دیتے ہیں۔ لیکن اگر یہی دلیل محمد کے امی ہونے کی ہے تو پھر قرآن نے تو اہل عرب کو بھی امی کہا ہے، ملاحظہ فرمائیں سورۃ جمعہ کی آیت 2، سورۃ آل عمران کی

آیت 20۔ حالاں کہ اہل عرب میں پڑھے لکھے اور ان پڑھ سب تھے لیکن چونکہ وہ علم دین اور کتب سماوی سے بے بہرہ تھے، اس لیے ان کو ایسا لقب دیا گیا اور یہ اصطلاح بھی یہودیوں کی تھی۔ اہل اسلام کی اصطلاح "جاہلیت" ہے جو قرآن میں بھی آیا ہے۔ اسلام کے قبل جتنا زمانہ گذرا، سب کو اسی میں شمار کیا جاتا ہے۔
چنانچہ محمد کو امی کہہ کر یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ناخواندہ یا ان پڑھ تھے۔ علاوہ بریں محمد کے گھر میں اہل کتاب کے صحائف پڑھنے اور لکھنے والے بھی تھے مثلاً حبیب بن مالک اور عبداللہ بن سلام جو اگرچہ صحیح اور مستند کتابوں سے پوری طرح واقف نہ تھے تو بھی روایتوں اور قصے کہانیوں کو کچھ نہ کچھ ضرور جانتے تھے جو اس زمانے کے یہودیوں کے درمیان مروج تھیں۔ اگر اسے تسلیم کرنے میں کسی کو تامل ہے تو پھر وہ مجھے بتلائے کہ اہل یہود کی وہ حدیثیں آپ نے کہاں سے سیکھی تھیں جو رات بھر آپ اپنے اصحاب کو سنایا کرتے تھے؟

تبصرہ :

○ ملحد نے جو روایت پیش کی یہ روایت ذخیرہ احادیث میں تلاش کے باوجود ہمیں نہیں ملی۔ اس حدیث کی سند وحوالہ موجود نہ ہونے کی صورت میں یہ سوال ہی احمقانہ ہے کہ آپ اہل یہود کی قصہ گوئی صحابہ کرام کو بیان کیا کرتے تھے۔ بلاسند ومتن وحوالہ ایک حدیث لکھ کر اس سے خود ساختہ استنباط کرنا دھوکہ دہی ملحدین کا ہی وصف ہے۔

○ ملحد نے یہ دعوی کیا کہ امی اصطلاح یہودیوں کی ہے؟ حالانکہ یہود کے ہاں ایسی کوئی اصطلاح موجود نہیں؟ ملحد کو معلوم ہے کہ اسکو پڑھنے والے فری تھنکرز صم بکم ہیں انکو بیان کردہ اگر وہ اسلام کے مخالف ہوا تو یقین کر لیں گے، اس لیے گھڑی جاو جو دل میں آتا ہے۔۔

○ نبی کریم ﷺ کے گھرانے میں اہل کتاب کے صحائف پڑھنے والے تو نہ تھے البتہ صحابہ کرام میں یہودیوں کے کبار اور جید علماء ضرور موجود تھے جو حق کو پہچان اور تورات میں مرقوم نبی آخرالزماں کی نشانیاں پہچان کر آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لا چکے تھے۔

ملحد: قصہ ہابیل و قابیل کا :

قرآن میں آدم کے دونوں بیٹوں کا قصہ سورہ مائدہ، آیت نمبر 27 تا 32 میں مذکور ہے۔ یہودیوں کی روایتوں میں دونوں بھائیوں کی یہ فرضی گفتگو کئی طرح سے بیان ہوئی ہے۔ تارگوم جوناتھن اور تارگوم یروشلمی (Targum ofJonathan and Targum of Jerusalem) میں مرقوم اس قصے اور قرآن کی مذکورہ بالا آیات میں مندرج قصے میں فرق صرف اتنا ہی ہے کہ وہاں تو کوے سے قائن (جس کو عربی کتابوں میں قابیل لکھا گیا ہے) کو مردہ گاڑنا سکھایا جب کہ یہاں آدم کو۔ سنی سنائی بات ہونے کے سبب یہ فرق پیدا ہوا تھا۔ اس کا ایک بہت بڑا ثبوت خود قرآن میں موجود ہے، یعنی اس قصے کے تعلق سے جو آخری آیت ہے "اس قتل کی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ حکم نازل کیا کہ جو شخص کسی کو قتل کرے گا، (یعنی) بغیر اس کے کہ جان کا بدلہ لیا جائے یا ملک میں خرابی کرنے کی سزا دی جائے، اس نے گویا تمام لوگوں کو قتل کیا اور جو اس کی زندگانی کا موجب ہوا تو گویا تمام لوگوں کی زندگانی کا موجب ہوا اور ان لوگوں کے پاس ہمارے پیغمبر روشن دلیلیں لا چکے ہیں، پھر اس کے بعد بھی ان سے بہت سے لوگ ملک میں حد اعتدال سے گذر جاتے ہیں۔" (سورہ المائدہ: 32)
اس کا اس قصے سے کیا ربط ہے، واضح طور پر معلوم نہیں پڑتا۔ اس جگہ یہ کلام بالکل بے جوڑ ہے اور مفسرین قرآن کے پاس اسے مذکورہ قصے سے ربط دینے کا کوئی سامان موجود نہیں ہے۔ لیکن اس عقدے کا حل ہمیں کتاب عبرانی "مشناہ سنہدرین (Mishnah Sanhedrin) " کے باب 4، آیت 5 میں توریت کی اس آیت کی تفسیر میں ملتا ہے۔ وہ آیت کچھ یوں ہے، "تب خدا نے قائم سے کہا تو نے کیا کیا؟ تیری بھائی کا خون زمین سے مجھ کو پکارتا ہے۔" (پیدائش، باب 4، آیت 10) اصل عبرانی میں یہ لفظ خون صیغہ جمع یعنی "خونہا" استعمال ہوا ہے۔ مفسرین عبرانی نے اس لفظ کی رعایت سے اس میں یہ پہلو پیدا کیا ہے، "قائن جس نے اپنے بھائی کو مار ڈالا، اس کی نسبت یہ فرمایا گیا کہ تیرے بھائی کے خون پکارتے ہیں، یہ نہیں فرمایا کہ تیرے بھائی کا خون بلکہ تیرے بھائی کے خون تاکہ یہ بات روشن ہو جائے کہ جس کسی نے بنی اسرائیل میں سے ایک جان کو مار ڈالا تو موافق نوشتہ گویا اس نے ساری نسل کو جلا ڈالا۔"

تبصرہ:

ملحد نے گھما پھرا کے اپنا ایک نتیجہ پیش کرنا ہوتا ہے ورنہ قتل کی آیت کے بعد قتل پر وعید کی آیت بالکل بے جوڑ نہیں۔ نیز یہ واقعہ تالمود میں نہیں بائبل کی کتاب پیدائش میں موجود ہے اور اس میں بھی کئی مقامات پر سنگین پیچیدیاں موجود ہیں جو کہ قرآنی بیان میں ہرگز نہیں۔ لہٰذا نفس واقعہ صرف یہ ہے کہ قرآن مجید نے

اصل واقعہ تنقیحا بیان کرکے تورات کے غلط بیان کی تصحیح کردی۔ جہاں تک عبرانی مفسر کی بات ہے تو معترض کو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ یہ عبرانی مفسر کا ذاتی دعوی ہے اور اسکا عیسوی شریعت میں کوئی ثبوت موجود نہیں ہے اور یہودیوں کا کوئی بھی عالم اس سے متفق نہیں ہے۔ ہم پہلے لکھ چکے کہ توارت کی تفاسیر میں بہت سی باتوں کی وضاحت انکے علماء نے پہلے صحیفوں سے کی تھی۔

ملحد:

"قرآن نے بہت سارے توراتی قصے نقل کیے جیسے زمین وآسمان کی چھ دنوں میں تخلیق، تخلیقِ آدم (علیہ السلام)، اور کچھ قوانین وغیرہ، تاہم یہ قصے تورات نے آس پاس کی تہذیبوں سے چوری کیے تھے"

تبصرہ:

ان الزامات کو ڈاکٹر ذاکر نائیک نے نہایت خوبصورت اور محکم دلائل کے ساتھ رد کیا ہے. ایک سوال کے جواب میں ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ اگر آپ قرآن اور بائبل کا جائزہ لیں تو کی مقامات پر ان میں یکسانیت پائی جاتی ہے. لیکن اگر آپ انکا گہرائی سے تجزیہ کریں تو ان میں خفیف سا فرق نظر آئے گا. اس فرق کو اگر آپ سائنسی معلومات کی روشنی میں دیکھیں تو یہ ۲ باتیں ثابت ہو جائیں گی. ایک قرآن کریم نے قصّوں کو نقل نہیں کیا ہے اور دوسری سائنسی معلومات کی روشنی میں قرآن کریم کی حقانیت بھی کھل کر ثابت ہو جاتی ہے.

۱) کائنات کی ۶ دنوں میں تخلیق:

بائبل میں ابتدائے آفرینش کی پہلی کتاب کے پہلے باب کے مطابق کائنات چھ دنوں میں تخلیق کی گئی ہے اور ہر دن چوبیس گھنٹوں پر مشتمل بتایا گیا ہے. جبکہ قران کریم میں لفظ ایام استعمال ہوا ہے. جو کہ ۲۴ گھنٹے کہ دن کی جمع کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور سال کی جمع کے لئے بھی بولا جاتا ہے. اس کا استعمال ایک زمانے اور ایک عہد کے لئے بھی کیا جاتا ہے جو کہ ایک غیر معین طور پر طویل ہو سکتا ہے جس پر سائنس کو اعتراض نہیں ہو سکتا.

۲) سورج کی تخلیق دن کی تخلیق کے بعد:

بائبل (پیدائش ۱ : ۳-۵) کہتی ہے کہ خدا نے دن اور رات کی تخلیق پہلے دن کی. دوسری طرف بائبل کے ہی مطابق (پیدائش—۱ : ۱۴-۱۹) سورج چوتھے دن تخلیق کیا گیا. جو کہ مضحکہ خیز حد تک غلط ہے.. دن اور رات کا ہونا سورج کے بغیر ممکن نہیں. قران کریم اس کے برعکس اس طرح کا کوئی بیان دیتا نظر نہیں آتا. اگر فاضل مضمون نگار کو اس طرح کے کسی بیان کا علم ہوتا تو مجھے قوی یقین تھا کہ وہ ایک لمحہ ضایع نہیں کرتے اپنا فیصلہ سنانے میں.

سوال پھر وہیں آجاتا ہے کہ اگر قران کریم کسی کتاب کی نقل ہے تو یہ مضحکہ خیزیاں قران میں کیوں نہیں؟

۳) سورج، چانداور زمین کی تخلیق:

بائبل (پیدائش: ۱ : ۱۱-۱۳) کے مطابق نباتات بیج والی گھاس، پودوں اور درختوں کے ساتھ تیسرے دن تخلیق کی گئی. جبکہ اسی جگہ (پیدائش—۱ : ۱۴-۱۹) یہ بتایا جا رہا ہے کہ سورج چوتھے دن تخلیق کیا گیا ہے. یہ سائنسی طور پر ممکن ہی نہیں ہے کہ سورج کے بغیر نباتات کی نمو ہوسکے. کیا فضل مضمون نگار اس طرح کی کوئی بات قران میں پاتے ہیں. اگر قران کریم نقل ہے تو وہ نباتات کو سورج سے پہلے کی تخلیق کیوں نہیں بتاتا؟

۴) چانداور سورج دونوں روشنی دیتے ہیں:

بائبل کے مطابق (پیدائش—۱ : ۱۶) " خدا نے دو روشنیاں تخلیق کیں. بڑی روشنی دن میں اجالا کرتی ہے اور چھوٹی روشنی رات میں " جبکہ سائنسی طور پر یہ بات صاف ہے کہ چاند کی اپنی کوئی روشنی نہیں لہٰذا اسکی روشنی کے بارے میں تخلیق کا لفظ استعمال کرنا غلط ہے. کیا فاضل مضمون نگار جانتے ہیں کہ قران کریم چاند اور سورج کی روشنیوں کے بارےمیں کیا کہتا ہے؟ قرآن کریم سورہ نوح میں کہتا ہے کہ:

وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا (۷۱ : ۱۶)

اور چاند کو ان میں (زمین) کا نور بنایا ہے اور سورج کو چراغ ٹھیرایا ہے.

کیا عربی میں مہارت رکھنے والے مّلی صاحب بتانا پسند کریں گے کے قرآن کریم میں سورج اور چاند کی روشنیوں کے حوالے سے الگ الگ الفاظ کیوں استعمال ھوئے؟ چاند کے لئے قران کریم میں قمر کا لفظ استعمال کیا ہے اور اسکی روشنی کے لئے "منیر" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو کہ عکسی روشنی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے. کیا فاضل مضمون نگار بتانا پسند کریں گے کہ نبی کریم صلی اللہ علیھ وسلم کو چودہ سو سال پہلے یہ حقیقت کس نے بتائی تھی کہ چاند کی اپنی روشنی نہیں ہے؟ پھر وہی سوال کہ اگر قرآن کریم نقل ہے تو یہ کیسی نقل ہے کہ جو سائنسی غلطیوں کو نقل نہیں کرتی؟

۵ (آدم پہلے انسان تھے جو ۵۸۰۰ سال پہلے دنیا میں تھے:

بائبل میں حضرت عیسیٰ علیھ السلام کا شجرہ نسب حضرت ابراہیم علیھ السلام تک اور پھر ان سے حضرت آدم علیھ السلام تک بتاتے ھوئے بائبل کہتی ہے کہ آدم زمین پر ۵۸۰۰ سال پہلے آئے تھے. جس میں ۱۹۴۸ سال کا وقت حضرت ابراہیم علیھ السلام اور حضرت آدم علیھ السلام کے درمیان گزرا. ۱۸۰۰ سال کا وقت حضرت ابراہیم علیھ السلام اور حضرت عیسیٰ علیھ السلام کے درمیان گزرا اور حضرت عیسیٰ علیھ السلام سے اب تک ۲۰۰۰ سال گزر چکے ہیں. جبکہ علوم آثار قدیمہ اور ارضیات کے مطابق ۱۰ ہزار سال یا اس سے بھی پہلے تک انسان کی اس زمین پر موجودگی کے شواہد موجود ہیں. بائبل کے اس بیان کے برعکس قرآن کریم میں اس طرح کا کوئی بیان نہیں جس میں انبیاء کے درمیان زمانوں کا درست وقت بتایا گیا ہو. کیا فاضل مضمون نگار یہ بتانا پسند کریں گے کہ کیا چیز تھی جسے قرآن کریم کو اس بظاھر دلچسپ تاریخ کو نقل کرنے سے روکا؟

۶ (طوفان نوح:

بائبل کے مطابق (پیدائش: ابواب ۸،۷،۶) طوفان نوح عام تھا جس نے دنیا کی ہر شے کو تباہ و برباد کر دیا تھا سوائے انکے جو اس کشتی میں سوار تھے. اس بیان کے مطابق یہ واقعہ حضرت آدم علیھ السلام کے ۱۶۵۶ سال بعد اور حضرت ابراہیم کی ولادت سے ۲۹۲ سال پہلے پیش آیا. اس وقت جب نوح علیھ السلام ۶۰۰ سال کے تھے اسکا مطلب یہ ہے کہ طوفان ۲۱ یا ۲۲ صدی قبل مسیح آیا تھا. جبکہ آثار قدیمہ کے مطابق اس وقت مصر میں گیارہویں اور بابل میں تیسری شاہی پشت نے کسی بھی تباہی کے بغیر حکومت کی. اور اس وقت ان تہذیبوں میں کوئی وقفہ نہیں آیا جیسا کہ طوفان کی وجہ سے آنا چاہیے تھا. کیا فاضل مضمون نگار قران میں کوئی ایسا بیان دیکھتے ہیں کہ جس کے مطابق طوفان نوح کی عمومیت کا بیان ہو؟ کیا فاضل مضمون نگار یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیھ وسلم نے بائبل وغیرہ سے یہ کہانی لی اور اپنے طور پر ریسرچ کر کے اسکو اغلاط سے پاک کیا اور قران کریم میں ڈال دیا (معاذ اللہ(

قرآنی احکامات جہاد اور ملحد کی ایک غلطی

ملحد نے جہاد کے متعلقہ احکامات کی آیات کے متعلق یہ دعوی کیا کہ یہ حضور ﷺ کی بنائی ہوئی ہیں۔ ہمارا سوال یہ ہے کہ ان کے متعلق بھی یہ دعوی کیوں نہیں کیا جاسکتا کہ یہ قدیم آسمانی کتب سے چرائی گئی ہیں، اس بات کا 'ثبوت' باآسانی مل بھی سکتا ہے، جہاد کا حکم پرانی شریعتوں میں بھی موجود تھا، بائبل وغیرہ میں ایسی کئی آیات موجود ہیں، ان کی بنیاد پر باآسانی یہ دعوی کیا جاسکتا ہے کہ یہ بائبل سے چرائی گئی ہیں۔ مثلا:

"جب تم شہر پر حملہ کرنے جاؤ تو وہاں کے لوگوں کے سامنے امن کا پیغام دو۔ اگر وہ تمہارا پیغام قبول کرتے ہیں اور اپنے پھاٹک کھول دیتے ہیں اُس شہر میں رہنے والے تمام لوگ تمہارے غلام ہو جائیں گے اور تمہارا کام کرنے کے لئے مجبور کئے جائیں گے۔ لیکن اگر شہر امن کا پیغام قبول کرنے سے انکار کرتا ہے اور تم سے لڑتا ہے تو تمہیں شہر کو گھیر لینا چاہیے۔ اور جب خداوند تمہارا خدا شہر پر تمہارا قبضہ کراتا ہے تب تمہیں تمام آدمیوں کو مار ڈالنا چاہیے۔ تم اپنے استعمال کے لئے عورتیں بچے جانور اور شہر کی ہر ایک چیز لے سکتے ہو۔ خداوند تمہارے خدا نے تمہارے دشمنوں کی مالِ غنیمت تم کو دی ہیں۔ جو شہر تمہاری ریاست میں نہیں ہیں اور بہت دور ہیں اُن سبھی کے ساتھ تم ایسا برتاؤ کروگے۔ لیکن جب تم وہ شہر لیتے ہو جسے خداوند تمہارا خدا تمہیں دے رہا ہے تب تمہیں ایک بھی چیز کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہیے۔

(Deuteronomy) استثناء، اصحاح: 20: 16 تا 11(

اور

"داؤد اور اُس کے آدمی گئے اور جسوریوں، عمالیقیوں اور جزریوں پر چھاپا مارا۔ داؤد نے اُس علاقہ کے لوگوں کو شکست دی۔ داؤد نے اُن کی سب بھیڑیں مویشی، گدھے، اونٹ اور کپڑے لے لئے اور اُنہیں واپس اکیس کے پاس لایا لیکن داؤد نے اُن لوگوں میں کسی کو زندہ نہ چھوڑا۔ داؤد نے ایسا کئی بار کیا۔"
(1 Samuel) سموئیل 1 : اصحاح 27 : 10-8)

کئی ایسی آیات بھی ہیں جو قرآنی احکامات سے بالکل میچ کرتی ہیں۔ انجیل متی کی آیت ہے:

"یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کروانے آیا ہوں۔ صلح کروانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں، کیونکہ میں اس لئے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے، اور بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کر دوں۔"
اس قول کے آگے روایت یوں ہے:
"اور آدمی کے دشمن اس کے گھر ہی کے لوگ ہوں گے۔ جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں اور جو کوئی بیٹے یا بیٹی کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں۔ اور جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ چلے وہ میرے لائق نہیں۔ جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اسے کھوئے گا اور جو کوئی میری خاطر اپنی جان کھوتا ہے اسے بچائے گا۔" (انجیل متی، باب 10، آیات 36 تا 39)

قرآن کریم میں دیکھیں تو اس میں بھی مومنوں سے یہی مطالبہ کیا گیا کہ اللہ، اس کے رسول اور جہاد کی خاطر انہیں تمام رشتوں اور علائق کو نظر انداز کرنا ہوگا (سورۃ التوبۃ، آیت 23-24)؟

"تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں کچھ تمہارے دشمن ہیں۔" (سورۃ التغابن، آیت 14)؟

قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول آیا ہے کہ "جو میرے پیچھے چلا وہی مجھ سے ہے۔" (سورۃ ابراہیم، آیت 36)؟

کیا حدیث میں آیا کہ "تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اسے اپنے باپ، اپنے بیٹے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔" (صحیح بخاری، کتاب الایمان، حدیث رقم 14)؟

اگر یہی بائبل اور پرانی شریعتوں کی تعلیم بھی ہے تو پھر ان آیات کے متعلق ملحد صاحب نے یہ دعوی کیوں نہیں کیا کہ یہ احکامات پرانی کتابوں سے چرائے گئے ہیں؟ ملحد کے سارے ورک کو دیکھیں تو اسکی وجہ یہی لگتی ہے کہ ملحد نے اپنی کتاب کا پہلے سے جو سکیچ بنایا تھا اس میں مصنفین کے خانوں میں اک خانہ حضور ﷺ کا بھی رکھا تھا، بعد میں اس نے قرآن پر نگاہ ڈالتے ہوئے مختلف خانوں پر جو آیات تقسیم کیں تو حضور ﷺ کے حصے میں جہاد کے متعلقہ احکامات کی آیات آئیں کہ یہ حضور ﷺ کی بنائی ہوئی ہیں، حالانکہ یہ آیات بھی اتنی ہی فصیح و بلیغ ہیں جو اک شاعر کے حصے میں آئیں اور ان میں بھی ایسی باتیں موجود ہیں جو قدیم کتابوں سے ماخوذ سیکشن میں رکھی آیات میں ہیں۔ یہی حال ان آیات کا بھی ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حصے میں ڈالی گئیں۔ اندھا بانٹے ریوڑیاں ۔۔

حضرت عائشہ و حضرت زینب رضی اللہ عنہ:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کے متعلق ملحد نے کچھ روایات کی بنیاد پر یہ مفروضہ گھڑا کہ وہ چونکہ کم عمر تھی اس لیے انکو دھوکا دینا آسان تھا، حضور ﷺ اپنی وحی کو انکے ذریعے ثابت کرتے تھے کہ یہ انکے بستر پر نازل ہوئی۔ ملحد کے اس مفروضے کے پیچھے دو مزید مفروضے قائم ہیں ایک یہ کہ سارا قرآن حضرت عائشہ کے بستر پر نازل ہوا۔ دوسرا یہ کہ حضرت عائشہ حضور ﷺ کی وفات تک کم سن ہی رہیں۔ تاریخ و حدیث سے ادنی تعلق رکھنے والا بھی جانتا ہے کہ یہ دونوں مفروضے جھوٹ پر مبنی ہیں۔ روایات سے یہ بات واضح ہے وحی مسجد میں، دوران جنگ، سفر میں، ام ایمن رضی اللہ عنہا کے گھر وغیرہ کئی جگہوں پر اور اصحاب رسول ﷺ کے

سامنے بھی نازل ہوتی رہی ، دوسرے مفروضے کی حقیقت یہ ہے کہ حضرت عائشہ کی بلوغت کے بعد حضور ﷺ سے شادی ہوئی تھی ۔ ہم جانتے ہیں وحی حضور ﷺ کی وفات تک نازل ہوتی رہی ، جب حضور ﷺ کا انتقال ہوا آپ کی عمر اٹھارہ برس تھی ۔ کیا اٹھارہ سال کی عمر کم سنی کی عمر کہلاتی ہے ؟ کیا کوئی اتنا عرصہ اس عمر کی کسی عورت کو دھوکے میں رکھ سکتا ہے اور وہ بھی اپنی بیوی کو ۔ مزید حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کی وفات کے بعد بھی تقریبا پچاس سال زندہ رہیں لیکن کبھی آپ نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے حضور ﷺ پر شک کا کوئی پہلو نکلتا ہو ۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو حضور ﷺ کی وفات کے بعد کم از کم آپ کے دل میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشن کی ہر گز قدر و عزت قایم نہیں رہ سکتی تھی ، ان کے قدم میں یہ استقلال کبھی نہ پیدا ہوتا اور وہ اس مصنوعی اور فرضی نبوت کے لئے ہر گز اس قدر مالی اور جانی قربانیاں نہیں پیش کر سکتی تھیں ۔ نیز یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جس کا علم حضرت عائشہ تک محدود رہ جاتا ۔ عرب کے کھلے صحرائی ماحول میں یہ دھوکہ دہی ممکن نہیں تھی ۔ آپ کی قوم سے جو آپ کی ہر حرکت و سکون کی پوری نگراں تھی اس راز کا محفوظ رہنا اور فاش نہ ہونا بالکل ناممکن تھا ۔

حضور ﷺ کے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کے متعلق ملحد کے اعتراض اور گھڑے مفروضے پر ہم پہلے ایک تحریر میں تبصرہ پیش کر چکے ہیں اسکو یہاں پیش کیا جاتا ہے ۔

تاریخ طبری اور دوسری کچھ تاریخی کتابوں میں حضور ﷺ کی حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے شادی کے متعلق کچھ روایات آئی ہیں جن کو مستشرقین و ملحدین نے ایک لو سٹوری کی شکل میں پیش کیا جسکا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت زینب کی حضرت زید کے ساتھ شادی کے بعد حضور ﷺ کو زینب اچھی لگنے لگی گئی تھیں اور آپ اسکو چھپاتے تھے ، بالاخر حضرت زید نے زینب کو طلاق دے دیدی اور حضور ﷺ نے زینب سے شادی کر لی ۔ نعوذ باللہ

یہ روایات عیسائی مورخیں کا مایہ استناد ہے اور اب انکے شاگرد ملحدین انکے نگلے ہوئے نوالے چبا رہے ہیں ۔ ان متعصبین کو اس سے کوئی سروکار نہیں کہ اصول فن کے لحاظ سے روایت کس پایہ کی ہے ۔ اسکا راوی کون ہے ، اسکے بارے میں اسم ورجال کی کتابوں میں کیا کیسی گوائیاں نقل کی گئی ہیں ۔ انکو بس اعتراض کا موقع چاہیے ، کسی روایت سے کچھ بھی ثابت کر دیں گے ۔

ان راویات کے اکثر راوی ضعیف ہیں اس لیے یہ قابل اعتبار نہیں ، پھر تاریخ سے زیادہ مستند سورس قرآن اور حدیث میں حضور ﷺ ، حضرت زید اور زینب کے معاملے پر تفصیل موجود ہے اس لیے ان تاریخی روایات کو لینے اور ان پر مزید کسی بحث کی ضرورت نہیں رہتی ۔

حضور ﷺ اور زینب کا نکاح ۔اصل واقعہ قرآن و حدیث کی روشنی میں

حضور ﷺ نے حضرت زید کو جو کہ آپ کے آزاد کردہ غلام تھے منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا ' جب وہ سن بلوغ کو پہنچے تو آپ نے انکی شادی اپنی پھوپھی زاد حضرت زینب سے کرنا چاہی ۔ حضرت زید چونکہ غلام رہ چکے تھے اس لئے حضرت زینب کو یہ نسبت گوارانہ تھی ۔ (فتح الباری تفسیر سورۃ الاحزاب بحوالہ ابن ابی حاتم (

لیکن بالاخر حضور ﷺ کے ارشاد کی تعمیل میں راضی ہو گئیں اور تقریبا ایک سال تک حضرت زید کے نکاح میں رہیں لیکن دونوں میں رنجش رہتی تھی یہاں تک کہ حضرت زید نے حضور ﷺ کی خدمت میں آکر شکایت کی اور انکو طلاق دینا چاہا ۔ (فتح الباری تفسیر سورۃ الاحزاب بحوالہ روایت عبد الرزاق از معمر از قتادہ (

حضرت زید نے حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کی کہ زینب مجھ سے زبان درازی کرتی ہے میں اسکو طلاق دینا چاہتا ہوں ۔ لیکن حضور ﷺ بار بار انکو سمجھاتے کہ طلاق نہ دیں ۔ جیسا کہ قرآن میں ہے

وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ ۔ (سورۃ الاحزاب آیت 37 (

ترجمہ : اور جبکہ تم اس شخص سے جس پر اللہ نے اور تم احسان کیا تھا یہ کہتے تھے کہ اپنی بیوی کو نکاح میں لئے رہو اور اللہ سے خوف کرو ۔

لیکن پھر بھی نباہ نا ہو سکا اور آخر حضرت زید نے حضرت زینب کو طلاق دے دی ۔ حضرت زینب حضور ﷺ کی پھوپھی زاد بہن تھیں اور آپ ہی تربیت میں پلی تھیں اور آپ ﷺ کے ہی فرمانے سے زینب نے اس رشتہ جس کو وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھیں ' قبول کیا تھا ۔ اب وہ عین جوانی میں طلاق یافتہ ہو گئیں تو آپ ﷺ نے انکی دلجوئی کے لیے خود ان سے نکاح کرنا چاہا ' لیکن عرب میں اس وقت تک منہ بولا بیٹا اصلی بیٹے کے برابر سمجھا جاتا تھا ۔ اس لئے عام لوگوں کے خیال سے آپ

ﷺ تامل فرماتے رہے۔ حتی کہ آیت نازل ہو گئی۔

وَتُخۡفِیۡ فِیۡ نَفۡسِکَ مَا اللّٰہُ مُبۡدِیۡہِ وَتَخۡشَی النَّاسَ وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنۡ تَخۡشٰہُ۔ (سورۃالاحزاب آیت 37)

ترجمہ: اور تم اپنے دل میں وہ بات چھپاتے ہو جس کو اللہ ظاہر کر دینے والا ہے اور تم لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ ڈرنا اللہ سے چاہیے۔

غرض آپ ﷺ نے اس آیت کے نزول کے بعد حضرت زینب سے نکاح کر لیا اور جاہلیت کی یہ قدیم رسم کہ 'متبنّیٰ اصلی بیٹے کا حکم رکھتا ہے' کا خاتمہ ہو گیا۔

یہ اصل واقعہ تھا جس کو چھوڑ کر مستشرقین اور عیسائی مشنریوں نے تاریخی روایات کو لیا اور حضور ﷺ کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ اس واقعہ کی تائید کئی صحیح احادیث سے ہوتی ہے اور ان آیات سے پہلے اور بعد میں آنے والی آیات بھی اسی پس منظر کی گواہی دیتی ہیں۔ جب یہ واقعہ ہوا تو منافقین نے کہنا شروع کیا کہ یہ رسول ایک طرف تو بیٹوں کی بیویوں سے نکاح حرام قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف خود اپنی بہو سے نکاح کرتے ہیں، اس پر سورۂ احزاب کی آگے آیت نمبر ۴۰ نازل ہوئی، فرمایا گیا:

"محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں؛ بلکہ اللہ کے پیغمبر اور نبیوں کے ختم کرنے والے ہیں، اللہ ہر چیز سے واقف ہے" (سورۂ احزاب ۴۰)

اب تک زیدؓ عام طور پر زیدؓ بن محمد (ﷺ) کہلاتے تھے، سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۵ میں یہ فرمایا:

) "اے ایمان والو) اپنے منہ بولے بیٹوں کو ان کے حقیقی باپوں کے نام سے پکارا کرو کہ اللہ کے نزدیک انصاف کی بات یہی ہے، بس اگر تم ان کے باپوں کے نام نہ جانتے ہو تو وہ دین میں تمہارے بھائی اور دوست ہیں اور جو بات تم سے غلط ہو گئی ہو تو اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں اور لیکن جو دل کے ارادے سے کرو (اس سے بازپرس ہو گی) اور اللہ بخشنے والا (اور) مہربان ہے"

) سورۂ احزاب: ۵(

اس حکم کے بعد انہیں اپنے باپ کی نسبت سے زیدؓ بن حارثہ پکارا جانے لگا۔

) سیرت النبی شبلی نعمانی جلد اول(

موافقات عمر:

حضور ﷺ کے صحابہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ کے کردار اور صفات کا تاریخی جائزہ لیں تو نظر آئے گا وہ بلاشبہ ایک عبقری صفت آدمی تھے، انہوں نے اپنے دور خلافت میں بھی جو جو مختلف شعبہ جات میں اصلاحات کیں، جو سسٹم بنائے انکی بنیاد پر اسلام کے دشمنوں نے بھی انہیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کی عبقری شخصیت کے بارے میں اسی لیے فرمایا تھا کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے (راوہ الترمذی) اور "اللہ تعالیٰ نے عمر کی زبان اور دل میں حق رکھ دیا ہے۔" (جامع ترمذی) وہ حق ہی کہتا ہے۔" (سنن ابوداؤد) وجہ یہی تھی کہ ان کے منہ سے وہی بات نکلتی جو حقیقت پر مبنی اور حق ہی کی آئینہ دار ہوتی۔ کئی آیات ایسی نازل ہوئیں جن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تجویز، رائے، قول کی موافقت کی گئی۔ ایسے شان نزول سے وابستہ یعنی حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالی عنہ کی موافقت رکھنے والی آیات متعدد ہیں، محدثین و مورخین کی اصطلاح اور حقیقت پر مبنی کلمات کے بموجب" موافقات عمر" رضی اللہ عنہ کہا جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح کے پچھلی امتوں میں بھی ایسے لوگ گزرے جو نبی تو نہ ہوتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور توجہ ان کے قلب سے گویا گفتگو کرتی تھی۔ اللہ فرشتوں کے بغیر وحی کی سورتوں کے بغیر ہی اپنی باتیں ان کے دلوں میں القا فرمایا کرتے تھے۔ ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے موافقت رکھنے والی کچھ آیات کو انکے اصل شان نزول کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

1۔ حجاب کے احکام سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! ازواج مطہرات کے سامنے طرح طرح کے لوگ آتے ہیں اس لیے آپ انہیں پردے کا حکم دیجیے۔ اس پر یہ آیت نازل ہو گئی۔

وَاِذَا سَاَلۡتُمُوۡهُنَّ مَتَاعًا فَسۡـئَلُوۡهُنَّ مِنۡ وَّرَآءِ حِجَابٍ۔

''اور جب تم ان سے برتنے کی کوئی چیز مانگو تو پردے کے باہر مانگو''۔ (الاحزاب: ۵۳،(

2۔ بدر کے قیدیوں کے متعلق بعض نے فدیہ کی رائے دی جبکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں قتل کرنے کا مشورہ دیا۔ اس پر آپ کی موافقت میں یہ آیت نازل ہوئی۔

لَوۡلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمۡ فِيۡمَاۤ اَخَذۡتُمۡ عَذَابٌ'' عَظِيۡمٌ''۔

''اگر اللہ ایک بات پہلے لکھ نہ چکا ہوتا تو تم نے جو کافروں سے بدلے کا مال لے لیا، اس میں تم پر بڑا عذاب آتا''۔ (الانفال: ٦٨(

3۔ حرمت سے قبل مدینہ طیبہ میں شراب اور جوئے کا عام رواج تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بارگاہِ نبوی میں عرض کی، ہمیں شراب اور جوئے کے متعلق ہدایت دیجیے کیونکہ یہ مال اور عقل دونوں ضائع کرتے ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

يَسۡـئَلُوۡنَكَ عَنِ الۡخَمۡرِ وَالۡمَيۡسِرِؕ قُلۡ فِيۡهِمَاۤ اِثۡمٌ ''كَبِيۡرٌ''۔

''تم سے شراب اور جوئے کا حکم پوچھتے ہیں، تم فرما دو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے''۔ (البقرۃ: ۲۱۹،(

4۔ ایک بار ایک شخص نے شراب کے نشہ میں نماز پڑھائی تو قرآن غلط پڑھا۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پھر وہی عرض کی تو یہ آیت نازل ہوئی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَقۡرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنۡتُمۡ سُكٰرٰى۔ (النسائ: ۴۳(

''اے ایمان والو! نشہ کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ''

5۔ اسی سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بار بار دعا کی، الٰہی! شراب اور جوئے کے متعلق ہمارے لئے واضح حکم نازل فرما۔ یہاںتک کہ شراب اور جوئے کے حرام ہونے پر یہ آیت نازل ہو گئی۔

اِنَّمَا الۡخَمۡرُ وَالۡمَيۡسِرُ وَالۡاَنۡصَابُ وَالۡاَزۡلَامُ رِجۡسٌ ''مِّنۡ عَمَلِ الشَّيۡطٰنِ فَاجۡتَنِبُوۡهُ۔

''بیشک شراب اور جوا اور بت اور پانسے ناپاک ہی ہیں شیطانی کام، تو ان سے بچتے رہنا کہ تم فلاح پاؤ''۔ (المائدۃ: ۹۰(

6۔ جب منافق عبداللہ ابن اُبی مرا تو اُس کے لوگوں نے رسول اُللہ سے اس کی نماز جنازہ پڑھانے کے لئے درخواست کی۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی، یا رسول اللہ! عبداللہ ابن اُبی تو آپ کا سخت دشمن اور منافق تھا، آپ اُس کا جنازہ پڑھیں گے؟ رحمتِ عالم انے تبلیغ دین کی حکمت کے پیشِ نظر اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ یہ آیت نازل ہو گئی،

وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ مَّاتَ اَبَدًا۔'

'اور جب ان (منافقوں) میں سے کوئی مرے تو اس پر نماز نہ پڑھیے''۔

7۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر جب منافقوں نے بہتان لگایا تو رسول اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مشورہ فرمایا۔ آپ نے عرض کی، آپ کا اُن سے نکاح کس نے کیا تھا؟ حضور اکرم نے ارشاد فرمایا، اللہ نے! اس پر آپ نے عرض کی، کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ آپ کے رب نے آپ سے اُن کے عیب کو چھپایا ہوگا، بخدا یہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر عظیم بہتان ہے۔

سُبۡحٰنَكَ هٰذَا بُهۡتَانٌ'' عَظِيۡمٌ''۔ اسی طرح آیت نازل ہوئی۔ (النور: ١٦(

8۔ دو شخص لڑائی کے بعد انصاف کے لیے بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے۔ حضور ﷺ نے ان کا فیصلہ کر دیا لیکن جس کے خلاف یہ فیصلہ ہوا، وہ منافق تھا۔ اس نے کہا کہ چلو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس چلیں اور ان سے فیصلہ کرائیں۔ چنانچہ یہ دونوں پہنچے اور جس شخص کے موافق حضور نے فیصلہ کیا تھا اس نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا، حضور نے تو ہمارا فیصلہ اس طرح فرمایا تھا لیکن یہ میرا ساتھی نہیں مانا اور آپ کے پاس فیصلہ کے لئے لے آیا۔ آپ نے فرمایا، ذرا ٹھہرو میں آتا ہوں۔ آپ اندر سے تلوار نکال لائے اور اس شخص کو جس نے حضور کا فیصلہ نہیں مانا تھا، قتل کر دیا۔ دوسرا شخص بھاگا ہوا رسولُ اللہ اکی خدمت میں حاضر ہوا اور اس واقعہ کی اطلاع دی۔ آپ نے فرمایا، مجھے عمر سے یہ امید نہیں کہ وہ کسی مومن کے قتل پر اس طرح جرات کرے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس منافق کے خون سے بری رہے۔
فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ الخ۔
تمہارے رب کی قسم! وہ مسلمان نہ ہونگے جب تک اپنے آپس کے جھگڑے میں تمہیں حاکم نہ بنائیں پھر جو کچھ تم حکم فرمادو، اپنے دلوں میں اس سے رکاوٹ نہ پائیں اور جی سے مان لیں''۔ (النساء ۶۵(
۔ (تاریخ الخلفاء (

ان آیات کے متعلق ملحد کے اس دعوی کا کہ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گھڑی تھی' کا اسکے باقی آیات کے متعلق دعوں اور مفروضات کی طرح کوئی منطق یا تاریخی ثبوت موجود نہیں، بلکہ اس نے صرف لفظی زور آزمائی، ذاتی خیال آرائی اور مرضی کا سیاق و سباق دے کر ہی یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ملحد کی تحریر کو دیکھتے ہوئے اسکی ڈرامہ یا خاکہ نویسی کی صلاحیتوں کی داد تو دی جاسکتی ہے لیکن علمی دنیا میں اسے ایک تحقیق کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا، علمی دنیا میں اسکی حیثیت ایک لٹریری بلنڈر سے زیادہ کچھ نہیں۔ ملحد نے ان مفروضات کے لیے جن کتابوں سے استفادہ کیا، انکے متعلق محققین کی رائے آگے پیش کی جائیگی' اس سے بھی یہ واضح ہو جائے گا کہ اہل علم ایسی کہانیوں کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔
تبصرہ: عبداللہ غازی

کیا ہر مماثلت کا مطلب سرقہ ہوتا ہے ؟

آسمانی کتابیں چونکہ ایک ہی ماخذ سے آئیں (یعنی ایک ہی خدا کی طرف سے ہیں)۔ اس لیے واقعات کے بیان میں ان کتابوں میں کہیں نا کہیں مماثلت بھی پائی جاتی ہے ۔ یہاں سوال یہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر ایک ہی واقعہ کے متعلق دو مختلف کتابیں ایک جیسی تفصیل پیش کرتی ہیں تو کیا اسے سرقہ کہا جائے گا؟ یہ کیوں فرض کر لیا گیا ہے کہ ایک ہی واقعہ کی تفصیل ہر کتاب کو مختلف پیش کرنی چاہیے تھی جبکہ واقعہ ایک ہی ہوا تھا ۔؟
قرآن اور بائبل میں پائی جانے والی یکساں باتوں سے لازمی طور پر یہ مطلب نہیں لیا جاسکتا کہ اول الذکر مؤخر الذکر سے نقل کیا گیا ہے۔ اس پر دلائل ہم گزشتہ تحاریر میں پیش کر چکے ہیں ۔ فی الحقیقت یہ اس بات کی شہادت ہے کہ یہ دونوں کسی تیسرے مشترک ذریعے پر مبنی ہیں۔ تمام صحائف ربانی کا منبع ایک ہی ذات ، یعنی رب کائنات ہے، یہود و نصاریٰ کی کتب اور ان سے بھی قدیم آسمانی صحیفوں میں انسانی ہاتھوں سے کی جانے والی تحریفات کے باوجود، ان کے بعض حصے تحریف سے محفوظ رہے ہیں اور اسی لیے کہ وہ کئی مذاہب میں مشترک ہیں ۔
یہ بات درست ہے کہ قرآن نے بھی کچھ ایسے واقعات بیان کیے ہیں جنکا تذکرہ بائبل میں بھی موجود ہے لیکن صرف اس بنا پر محمد (ﷺ) پر یہ الزام لگانے کا کوئی جواز نہیں کہ انہوں نے بائبل سے کوئی چیز نقل کی یا اس سے اخذ کرکے قران مرتب کیا۔ اگر یہ منطق درست ہےتو یہ مسیحیت اور یہودیت پر بھی لاگو ہوگی۔مثلا پیغمبر نوح کو چند احکامات دیئے گئے اسی طرح کے احکامات پیغمبر موسیٰ کو ان کے بعد دیئے گئے۔ اگر نوحؑ کے پیروکار موسیٰؑ کے پیروکاروں کی تعلیمات کو اپنی تعلیمات کا سرقہ قرار دیں تو موسیٰؑ کے پیروکار اس کا کیسے جواب دیں گے۔ ؟ مزید یہ دعوی بھی کیا جاسکے گا کہ یسوع مسیح (علیہ السلام) نعوذ باللہ) سچے نبی نہیں تھے کیونکہ انھوں نے محض عہد نامہ عتیق کی نقل کرنے پر اکتفا کیا۔
عیسائی مستشرق ٹسڈل نے قرآن کے متعلق جو اعتراض دوہرائے ہیں، دیکھا جائے تو یہود نے انجیل کے متعلق پہلے سے یہ اٹھائے ہوئے ہیں کہ انجیل میں جو بھی اچھی باتیں ہیں وہ درحقیقت یہودی تعلیمات سے ماخوذ ہیں کیونکہ مسیحؑ نے اسی قوم میں پرورش پائی اور دعوی نبوت سے قبل علماء یہود سے دن رات مواعظ و نصائح سنے ۔ اسی طرح انجیل یونانی تعلیمات سے بھی ماخوذ ہیں کیونکہ اس زمانے میں انھوں نے اپنے علم کی بدولت آسمانوں پر کمندیں ڈالی ہوئی ہیں ، علوم عقلیہ اور خاص طور پر علم الاخلاق میں انکا طوطی بولتا تھا۔ اسی طرح یہ مجوسی تعلیمات سے بھی ماخوذ ہیں ۔
کیونکہ اس زمانے میں اکثر ممالک پر ان کا تسلط و اقتدار تھا اور انہی کے قوانین رائج تھے لہٰذا تلاش کرنے والے پر انکے علوم کم ہی مخفی رہ سکتے ہیں ؟
ایک عیسائی مشنری اس اعتراض کے جواب میں اپنی کتاب " حل الاشکال " میں لکھتے ہیں کہ " یہود کی اس بات کا کون اعتبار کریگا ؟ یعنی انکے اعتراض کی کوئی حقیقت نہیں ۔ کیا یہی جواب ہم بھی دے سکتے ہیں کہ قرآن کے متعلق مسیحیوں کی اس مجنونانہ بڑ کا کون اعتبار کریگا؟ جو حقیقت میں بھی محض تعصب کا اظہار اور مجنونانہ بڑ ہی ہے' جیسا کہ ایسے الزامات کے دیے گئے علمی و تحقیقی جوابات سے ظاہر ہے ۔
مزید ہم اس پر تفصیل پیش کر چکے ہیں کہ قرآن نے انبیاء و اقوام سابقہ کے متعلق جو تفصیل پیش کی ہے وہ بعینہی پرانی کتابوں میں موجود نہیں ہے ، قرآن نے ناصرف پرانی کتابوں کی غلطی کو دور کیا ہے، بلکہ ان کے متعلق مزید تفصیلات بھی پیش کی ہیں اور بہت سی جگہ تفصیلات ایسی ہیں کہ وہ پہلے کسی کتاب میں بھی موجود نہیں ہیں ۔
یہود و نصاریٰ سے علم حاصل کرنے اور مواد چرانے کےاس الزام پر کئی قسم کے سوال اٹھائے جاسکتے ہیں ۔ مثلا

۱۔ حضرت محمد ﷺ کی زندگی پر بے تحاشہ تاریخی مواد ہونے کے باوجود اور صدیوں تک ان کے سخت ناقدین بھی اس استاد کو کیوں نہ ڈھونڈ سکے جس سے آپ ﷺ نے تعلیم حاصل کی تھی۔؟

۲۔ محمد ﷺ کا ان کے ہم عصر لوگوں نے ۱۳ سال تک مذاق اڑایا، مخالفت کی اور ایذا دی۔ اتنے شدید دشمنوں کے درمیاں کیا یہ ممکن نہ تھا کہ یہ ثابت کیا جائے کہ آپ پر اترنے والی وحی من گھڑت تھی۔؟ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ اس شخص کا نام بتایا جاسکتا جس سے آپ نے تعلیم حاصل کی۔ مجبور ہوکے ان مخالفوں نے بعد میں آپؐ پے جادو گر اور غیر مرئی طاقتوں کا زیر اثر ہونے کا لزام لگایا۔

۳۔ محمدؐ اپنے لوگوں میں پروان چڑھے اور ان کی زندگی کا ہر پہلو ان پر عیاں تھا بلخصوص وہ کھلا پن جو صحرائی قبائلی زندگی کی خصوصیت ہے۔ اس طرح ان کے بہت سارے ہم عصروں نے جن میں ان کے قریبی رشتہ دار بھی شامل ہیں جو انہیں بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ انہوں نے محمد صلعم کی سچائی پر کیسے یقین کر لیا اگر انہیں اس بات کا شک ہوتا کہ محمد صلعم ایسی باتیں کر رہے ہیں جو انہیں دوسرے اساتذہ نے سکھائی ہیں جن کا نام لیے بغیر وہ ان باتوں کو اپنی طرف منسوب کر رہے ہیں۔؟

۴۔ وہ کس طرح کا استاد ہے جو محمد صلعم کو اتنا جامع اور مکمل دین سکھا سکتا تھا جس نے تاریخ کا چہرہ بدل دیا؟ وہ استاد عیسائیت و یہودیت کو وہ دین کیوں نہیں دے سکا؟ یہود و نصاری ایسے مبینہ استاد کے خلاف اس وقت کیوں نہ بولے جب محمد ﷺ مسلسل ان سے پڑھ کر بھی ان کو نظرانداز کر رہے تھے اور اپنی تعلیمات کا ماخذ کسی الہامی وسیلے کو قرار دے رہا تھا۔ یہ ہزار سال بعد کے مستشرق کو ہی کیسے نظر آ گیا؟

۵۔ ان کے بہت سے ہم عصر عیسائی اور یہودی کس طرح ان کی سچائی پر ایمان لے آئے اگر وہ جانتے تھے کہ آپ ﷺ ان کے صحائف کی نقل کر رہے ہیں یا پادریوں اور ربیوں سے تعلیم لے رہے ہیں؟

۶۔ قرآن کی کچھ وحی محمد ﷺ کے اوپر لوگوں کی موجودگی میں آئی۔ قرآن 23 سالوں کے عرصے میں موقع اور ضرورت کے تحت نازل ہوتا رہا وہ نظر نہ آنے والا پرسرار استاد کہاں تھا؟ اس نے اتنا عرصہ خود کو کہاں چھپائے رکھا۔ یا محمد ﷺ جو خود لوگوں میں ہر وقت گھرے رہتے تھے ان کے لئے کیسے ممکن ہوا اپنے استاد کو ۲۳ سال تک پوشیدہ ملتے رہے اور ایک دفعہ بھی نہ پکڑے گئے۔؟

ان تمام سوالوں کے جواب عیسائی مبلغین کبھی نہیں دے پائے نا دے سکیں گے؟ ہر وہ شخص جس نے محمدؐ کی زندگی کو ایمانداری سے پڑھا ہے وہ یہ دیکھ سکتا ہے کہ آپ ﷺ کی ایمان داری شعوری سرقہ بازی اور جعل سازی کی نفی کرتی ہے۔ اس کا اقرار خود مغربی محققین نے بھی کیا ہے۔ کیرن آرمسٹرانگ اپنی کتاب History of God میں محمدؐ پر وحی اللہ کی طرف سے کے عنوان میں لکھتی ہے

610ء کے دور میں حجاز کے ایک شہر مکہ کے ایک تاجر جس نے کبھی بائیبل نہیں پڑھی اور جس نے کبھی عیسیٰ جرمیا اور ازکائیل کے بارے میں نہیں سنا اس نے ایک ایسا تجربہ پیش کیا جو کہ بالکل ان کے مماثل تھا۔ "

(Karen Armstrong, A History Of God, 1993, Ballantine Books, New York, p.132)

ایک سوئس محقق Roger DuPasquier لکھتا ہے

" مسلم مخالف مصنفین کا تعصب اس دن تک کوئی بھی قابلِ دفاع وضاحت پیش نہیں کر سکا کس طرح ایک امیّ جو کہ ساتویں صدی کے قافلے کا مسافر ہے اس قابل ہو گیا اس طرح کی شاہکار تحریر تخلیق کر سکے جس میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ جذبات میں طلاطم پیدا کر سکے اور جس میں علم و دانائی ہو۔ جو اپنے ہم عصروں سے بہت اونچی کھڑی ہو۔ مغرب میں کی جانے والی وہ تحقیق جس میں آپؐ کے ان وسائل کو طے کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو آپؐ نے استعمال کیے اور اس نفسیاتی معاملہ پر روشنی دالنے کی کوشش کی ہے جس نے آپؐ کو اس قابل کیا کہ اپنے تحت الشعور سے رہنمائی حاصل کریں یہ بات صرف ایک چیز کو ثابت کرتی ہے۔ ان مصنفین کا مسلم مخالف تعصب "

(Roger DuPasquier, Unveiling Islam, 1992, The Islamic Texts Society, Cambridge, p.53)

قرآن توریت اور گوسالہ کا واقعہ - ایک موازنہ

قرآن مجید کے متعلق جتنے اعتراضات کیے جاتے ہیں ہم ان کے جواب میں پوری فراخدلی سے کام لینا چاہتے ہیں۔ ہمارے گزشتہ جوابات سے اگرچہ اعتراض کا وزن معلوم ہوگیا اور حقیقت بے نقاب ہو چکی ہے۔ لیکن ہم ملحدین اور عیسائی مشنریز کی ابھی اور کچھ ہمت افزائی کریں گے۔

ہم یہ تسلیم کیئے لیتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شام کے ایک دو نہیں بلکہ بہت سے سفر کئے اور تجارت کے لئے نہیں بلکہ محض تحصیل معلومات ہی کی غرض سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں تشریف لے گئے۔ اور دو چار روز نہیں بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی کا بہت سا حصہ اہل کتاب کے مرکز "دینی شام" ہی میں صرف کردیا۔ یہود و نصاریٰ قرآن کے بیان اور حقیقت کے الٹ حضور سے خاص محبت رکھتے تھے، انہوں نے آپ ﷺ سے اپنی کوئی بات نہیں چھپائی بلکہ اپنی ساری تفاسیر تک لاکے سامنے رکھ دیں، جس کا مطالعہ کرکے آپ ﷺ نے قرآن میں انکے بیان کردہ قصوں کو پیش کیا۔ ورقہ بن نوفل کے معلومات سے بھی آپ کو ایک دو دفعہ فائدہ حاصل کرنیکا موقع نہیں ملا بلکہ اسکو ہمیشہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ساتھ ہی رکھا۔ بلکہ ان تمام منزلوں سے آگے بڑھ کر ہم یہی فرض کئے لیتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود بھی امی نہ تھے اور آپ نہ صرف عربی میں بلکہ عبرانی، یونانی، سریانی اور ہر موجود زبان میں کتب مقدسہ کا مطالعہ خود کرسکتے تھے۔ اور آپ نے بائیبل کا بکثرت اور بارہا مطالعہ کیا۔ مگر ان تمام باتوں کے مان لینے کے باوجود بھی ہمارے مقدمے کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ ہمارا دعویٰ اسی طرح اپنی جگہ پر قایم ہے اور مخالفین اسلام کو اپنے پراپیگنڈے میں ذرہ برابر کامیابی نہیں مل سکتی.

واقعہ یہ ہے کہ

عیسائی مشنریز بائیبل کی جس قدر بھی حمایت کریں گے لیکن "مدعی سست گواہ چست" کیا کیجئے کہ خود کتب مقدسہ تو پیغمبر اسلام کی بعثت سے بھی صدیوں پہلے عیسائی مشنریز کی حمایت قبول کرنے سے استعفا دے چکی ہیں۔ یہودیت و نصرانیت کے دیوالیہ مذہبی خزانہ میں ان بے بہا جواہر کا نام بھی نہ تھا جن کی تلاش پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہوسکتی اور پیغمبر نے جن کو اپنے ذاتی خزانہ سے پیش کرکے تمام عالم اور خود یہود و نصاریٰ کی آنکھوں میں ہمیشہ کے لئے چکا چوند پیدا کردی۔ اہل کتاب کے عوام تو کیا ان کے مایہ ناز حاملان علم کی جبیں سنگ دختر ف کے سوا ان انمول موتیوں سے بالکل خالی تھیں جو اسلام کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی جاہل قوم پر نچھاور کردئے۔

اخذ و اقتباس کا معیار:

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ایک وہ کتاب جس کے مضامین کسی دوسری کتاب سے ماخوذ ہوں اور کسی دوسری تصنیف کے اقتباسات سے اسکو مرتب کیا گیا ہو لازمی طور پر اس کتاب کے مضامین اپنے ماخذ سے ملتے جلتے ہوں گے اور دونوں کے بیانات الفاظ کے فرق کے سوا نفس مطلب کے لحاظ سے بالکل متحد نظر آئینگے صرف یہی ایک معیار ہے جس کی بناء پر کسی تصنیف کو دوسری سے ماخوذ کہا جاسکتا ہے۔

معیار کی تطبیق:

قرآن مجید اور بائیبل دونوں کو سامنے رکھ کر ہم بعض واقعات میں دونوں کتابوں کو متفق البیان ضرور پاتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں بہت سے بیانات میں انتہا کا اختلاف اور حد درجہ تناقض و تباین نظر آتا ہے۔ اگر بائیبل کسی مقام پر رات کہتی ہے تو قرآن اسکے بالکل برخلاف دن بتلاتا ہے۔

اگر فی الحقیقت قرآن بائیبل سے ماخوذ ہوتا تو اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ متفقہ مقامات کے علاوہ اختلافی بیانات میں قرآن مجید راہ صواب سے ہٹکر غلطیوں میں مبتلا ہو جاتا اور بائیبل ہمکو صحیح راستہ پر نظر آتی جو مصنف قرآن کی کم علمی کی دلیل ہوتی لیکن ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جن مقامات پر قرآن اور بائیبل کا راستہ الگ ہوتا ہے وہاں بائیبل تاریکی میں ٹھوکریں کھاتی ہوئی اور قرآن مجید صراط مستقیم پر گامزن نظر آتا ہے اور اصول درائیت و تنقید, تاریخی آثار کے لحاظ سے ہمیں بائیبل کا بیان غلط اور قرآن مجید کی روش کو صحیح باور کرنا پڑتا ہے۔

بائیبل کے پرستار ہمیں یہ بتلائیں کہ جن مقامات پر بائیبل نے غلطیاں کی ہیں، وہاں پیغمبر اسلام کو صحیح واقعات کا علم کس ذریعہ سے ہوا؟ قرآن مجید کے کتاب اللہ اور اسکے مضامین کے وحی الٰہی ہونیکا اس سے روشن تر ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ بائیبل کو سامنے رکھنے کے بعد قرآن کا ترجمان وحی ہونا زیادہ روشنی میں آجاتا ہے تعرف الاشیاء باضدادھا۔

گزشتہ تحاریر میں ایسے کئی واقعات پر تبصرہ پیش کیا جاچکا ہے جن سے بائبل کی غلطی واضح ہے ذیل میں ہم مشتے نمونہ از خروارے ایک مشہور واقعہ 'بنی اسرائیل کی گو سالہ پرستی 'کا پیش کرتے ہیں جہاں قرآن اور بائیبل میں صریح مخالفت ہے، اور قرآن صراط حق پر اور بائیبل کجروی کر رہی ہے۔

توریت اور گوسالہ کا واقعہ :

اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسی پہاڑ سے اترنے میں دیری کرتا ہے تو دے ہارون کے پاس جمع ہوئے اور اسے کہا کہ اُٹھ ہمارے لئے معبود بنا کر ہمارے آگے چلیں کیونکہ یہ مرد موسی جو ہمیں مصر کے مالک سے نکال لایا ہم نہیں جانتے کہ اسے کیا ہوا ہارون نے انہیں کہا کہ زیور سونے کے جو تمہاری جوروؤں اور تمہاری بیٹوں بیٹیوں کے کانوں میں ہیں توڑ توڑ کر میرے پاس لاو۔ چنانچہ سب لوگ سونے کا زیور جو ان کے کانوں میں تھی توڑ توڑ کے ہارون کے پاس لائے اور اس ہاروں نے ان کے ہاتھوں سے لیا اور ایک بچھڑا ڈھال کر درست کیا اور انہوں نے کہا کہ اے اسرائیل یہ تمہارا معبود ہے جو تم کو مصر کے ملک سے نکال نکال لایا اور جب ہارون نے دیکھا تو اسکے آگے ایک قربان گاہ بنائی اور ہارون نے یہ کہہ کے منادی کی کہ کل خدا کے لئے عید ہے اور وہ صبح کو اٹھے اور سوختی قربانیاں چڑھائیں اور سلامتی کی قربانیاں گزارئیں اور لوگ کھانے پینے کے بیٹھے اور کھیلنے کو دتھے۔ تب خداوند نے موسی کو کہا کہ کہا کہ تو اتر جا کیونکہ تیرے لوگ جنہیں تو مصر کے ملک سے چھڑا لایا خراب ہو گئے ہیں اس ہدایت سے جو میں نے انہیں فرمائی جلد پھر گئے ہیں انہوں نے اپنے لئے ڈھالا ہو بچھڑا بنایا اور اسے پوجا اور اسکے لئے قربانی ذبح کرکے کہا کہ اے اسرائیل یہ تمہارا معبود ہے جو تمہیں مصر کے ملک سے چھڑا لایا۔ پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ میں اس قوم کو دیکھتا ہوں کہ ایک گردنکش قوم ہے۔ اب تو مُجھ کو چھوڑ کہ میرا غضب ان پر بھڑکے اور میں انہیں بھسم کروں اور میں تجھ سے ایک بڑی قوم بناوں گا۔ (توریت کتاب خروج، باب 32)

توریت کا بیان غلط ہونے کے اسباب :

توریت کا مذکورہ بالا بیان کس قدر پر از حیرت ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک نبی (ہارون علیہ السلام) بجائے اسکے کہ اپنی قوم کو راہ راست پر لائے اور ان کو ہدایت کرے, خدا کے مقابلہ میں علم بغاوت بلند کرتا, تولیم و ہدایت کی بیخ و بنیاد اکھاڑ کر شرک و بت پرستی کا سبق پڑھاتا ہے اور خود اپنے ہاتھ سے گوسالہ بنا کر قوم سے اسکے سامنے رسوم عبادت بجالانے اور پرستش کرنیکے لئے اپیل کرتا ہے۔

نبی اور وہ بھی وہ عظیم المرتبت نبی جسکو توریت کے بیان کے مطابق خداوند عالم نے تمام بنی اسرائیل میں سے منتخب کرکے اپنی مقدس کاہنی کی عزت دی اور اپنی بارگاہ سے خاص اعزاز واحترام کا مستحق قرار دیا جسکو کبھی جناب موسیٰ کی شرکت میں اور کبھی خود تنہا خداوند عالم سے ہمکلام ہونیکا اعلی شرف بھی حاصل تھا۔ (توریت کتاب احبار باب 14، 11، کتاب عدو باب 19، 14، 12، توریت کتاب عدو باب 18)

مذہبی تاریخ میں جناب ہاروں کی اعلی شخصیت اپنے برادر شفیق جناب موسیٰ کے ساتھ بنی اسرائیل کی اصلاح و ہدایت میں آپکا شریک کار ہونا اور موجودہ حالت میں جناب موسی کی غیبت میں نیابت موسوی کے فرائض انجام دینے کے لئے بنی اسرائیل میں آپ کی قیادت اور رب العالمین کی طرف سے آپ پر متواتر انعامات و احسانات اور آسمانی رحمت کا نزول ان تمام باتوں کو سامنے رکھنے کے بعد کسی طرح یقین یا وہم بھی نہیں ہو سکتا کہ جناب ہاروں اپنی اور اپنے بھائی کی ایک عرصہ کی ڈالی ہوئی بنیادوں کو خود اپنے ہاتھوں سے یکدم اکھاڑ پھینکیے اور ایک مدت کی جانکاہ مشقت و عرقریزی کے نتائج کو اس بیدردی کے ساتھ پامال کرینے کے لئے آمادہ ہوگئے اور اپنے رحیم و کریم خدا کی بارگاہ میں جو ان کو اپنی رحمت و عنایت کا مورد بنائے ہوئے ہے اس درجہ مرتبہ معرفت پر فائز ہونیکے باوجود اسکے مرحمت و احسان کا ذرہ برابر لحاظ نہ کرتے ہوئے ایسی بدترین نافرمانی کے لئے کمربستہ ہوئے.

ہماری اس حیرت کی بالخصوص اسوقت کوئی انتہا نہیں رہتی جب ہم دوسرے پہلو کو دیکھتے ہیں اور توریت میں ہماری نظر اس مکالمہ پر پڑتی ہے جو خدا اور جناب موسیٰ کے درمیان عین اس وقت ہو رہا تھا جبکہ بقول توریت جناب ہارون بنی اسرائیل میں گوسالہ پرستی کی ترویج واشاعت کر رہے تھے۔ اس مکالمہ میں بھی جناب ہارون ہی کے متعلق خدا جناب موسیٰ سے یہ کلام کر رہا تھا کہ ہارون کو مقدس کاہن اور امام بنایا جائے اور ہارون کے لئے بارگاہ قدرت سے مقدس کاہنی کے لباس کی تفصیلات بینا کی جا رہی تھیں۔

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا (توریت کتاب خروج باب 29، 28)

خدا کو بنی اسرائیل کے گمراہ ہوجانیکی اطلاع ہوئی جناب موسیٰ کو مکالمہ سے قوم کی خبر گیری کے لئے واپس کیا، اس وقت خلاق عالم کے قہر و غضب کی آگ تمام بنی اسرائیل کو جلا کر خاک سیاہ کردینے کے لئے آمادہ تھی مگر جناب موسیٰ کی سفارش بنی اسرائیل کے حق میں کامیاب ثابت ہوئی، یہ سب کچھ ہوا لیکن قابل صد حیرت کہ جناب ہارون کے دامن پر جو بقول توریت اس تمام ضلالت و گمراہی کے بانی اور خدائی انتقام کے مستحق تھے آتش قہر و غضب کی ایک چنگاری بھی اڑ کر نہ آئی، محبت آمیر لہجہ میں شکوہ تک نہ ہو بلکہ اسوقت بھی آسمانی رحمت کے مرکز نبی رہے۔ علم الٰہی کا بنی اسرائیل کی گمراہی سے باخبر ہونے کے باوجود گوسالہ کے اصل موجد جناب ہارون کے عمل سے یوں مطلع نہ ہونا ہماری حیرت میں اور اضافہ کردیتا ہے خصوصاً جبکہ ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس مقام پر جناب ہارون گوسالہ پرستی کی ترویج و اشاعت کر رہے تھے وہاں سے وہ مقام جہاں حضرت موسیٰ مکالمہ الٰہی میں مشغول تھے ایک یا دو میل سے زیادہ فاصلہ پر بھی نہ تھا۔

بغرض محال اگر اس وقت خدا اور حضرت موسیٰ جناب ہارون کے اس کارنامہ سے واقف نہ تھے اور ناواقفیت میں جناب ہارون کا یہ اعزاز و احترام بارگاہ قدرت سے کیا گیا تاہم اس واقعہ کے گزر جانے کے بعد ہی کچھ ترمیم ہوتی اور یہ عظیم الشان منصب اور عہدے جناب ہارون سے واپس لے لیے جاتے تب بھی ہم کو توریت کے بیان پر یقین کرنیکے لئے کچھ گنجائش تھی لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ گوسالہ پرستی کے واقعہ کے بعد بھی بارگاہ الٰہی میں جناب ہارون کا وہی اعزاز و احترام باقی ہے اور اسکی تجدید ہو رہی ہے۔

واقعہ مذکورہ کے ان تمام پہلوؤں پر نظر کرنے اور ان کے وحشتناک نتائج کو سامنے رکھنے کے بعد دنیا کا کوئی عاقل جو توحید و نبوت پر معرفت کے ساتھ ایمان رکھتا ہو کسی طرح توریت کے اس بیان کو صحیح باور نہیں کرسکتا جس میں نہ صرف جناب ہارون پر گوسالہ پرستی کی اشاعت و حمایت کا غلط اور بے بنیاد الزام قائم ہے بلکہ معبود حقیقی کو بھی جہالت و ناواقفیت کے اتہام کے ساتھ ایک بانی شرک پر انعام و اکرام جاری رکھنے کی وجہ سے شرک و بت پرستی کی تائید میں ملوث کرنے کو شش کی گئی ہے۔ جس کے دیکھنے سے توحید کی عظمت و جلالت قلب سے مٹ جانے کے بعد شرک جیسے بدترین گناہ کی کوئی اہمیت بھی نظر میں باقی نہیں رہتی۔ حامیان بائیبل کو یہ عقیدہ مبارک ہو جنکو بائیبل کی حمایت میں بائیبل کی اسطرح کی اور اس سے زیادہ ہزاروں وحشتناک تعلیمات کے سامنے سر جھکانا ہے۔

نتیجہ بحث بائیبل:

اسقدر طولانی بحث کے بعد بھی بفرض محال اگر ہم جناب ہارون کو اس اتہام سے یقینی طور پر بری نہ تسلیم کرسکیں تاہم اس قدر خلاف دلائل و قرائن کے ہوتے ہوئے ہم توریت کے بیان کو صحیح بھی نہیں باور کرسکتے البتہ توریت کے اس بیان سے ہمیں اتنا سبق یقینی طور پر ضرور حاصل ہوا کہ خدا کی نام نہاد (موجودہ توریت) کتاب فریضہ ہدایت انجام دینے کے بدلے ضلالت میں پیش پیش ہے اور دنیا کو تاریکی میں اسی طرح حیران و سرگرداں بنارہی ہے جس طرح بنی اسرائیل کو صحرا میں چھوڑا تھا بائیبل کے اسی قسم کے بیانات نے توحید و نبوت اور معارف روحانیہ کے وحشتناک خدوخال اور بھیانک صورتیں بنا کر مذہب کو ناقابل تلافی صدمہ پہنچایا اور اساس ہدایت کو متزلزل بنا دیا۔ توریت نے شرک و دیگر بداخلاقیوں کے ارتکاب اور اشاعت و حمایت کے جو غلط و بے اصل الزامات انبیاء اور مقربین بارگاہ الٰہی کے دامنوں پر لگائے ہیں انکی پاکیزہ ہستیاں ان الزامات سے یقیناً بری ہیں۔ لیکن نوع انسان کی پیشرو ہستیوں کو ان ذلیل اخلاق کے ساتھ انسان کے سامنے پیش کرکے عام انسان میں سیہ کاری کی جراءت و جسارت اور ارتکاب معاصی کا جذبہ پیدا کرانے اور اس طرح اخلاق رذیلہ کو عالم میں رواج دینے کا علمبردار بائیبل کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں (کیا خدائی کتابوں کی یہی شان ہوتی ہے؟ (

قران اور گوسالہ کا واقعہ:

اب ذرا قران مجید کو بھی ایک مرتبہ نظر غور سے ملاحظہ کیجئے۔ قرآن نے بھی بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کے واقعہ کو بیان کیا ہے لیکن اسطرح کہ اصول درایت کے لحاظ سے قرآن کے بیان کا ایک نقطہ بھی قابل انکار نہیں ہے بلکہ قرآنی آیات کے مطالعہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ بیان کرنیوالا اپنا ذاتی مشاہدہ پیش کر رہا ہے قرآن مجید نے جناب ہارون کے دامن عصمت کو گوسالہ پرستی کی نجاست سے اسی طرح پاک و صاف دکھلایا ہے جیسا کہ ایک نبی کے شایان شان ہے اور جس طرح ہر موقع پر امت کی ہدایت ایک نبی کے پیش نظر ہونا چاہئے۔ اگر بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کے موقع پر جناب ہارون کو منصب نبوت پر فریضہ ہدایت ادا کرتے ہوئے دیکھنا ہے تو وہ صرف قرآن ہی پیش کرسکتا ہے۔

قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ 85 فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۭ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ 86 قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ 87 ۙ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰـهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۥ فَنَسِيَ 88 اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ڏ وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا 89 ۧ وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ 90 قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى 91 قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا 92 ۙ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ۭ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ 93 قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّىْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ 94

اللہ نے فرمایا کہ ہم نے تمہاری قوم کو تمہارے بعد آزمائش میں ڈال دیا ہے اور سامری نے ان کو بہکا دیا ہے۔ اور موسیٰ غم اور غصے کی حالت میں اپنی قوم کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اے قوم کیا تمہارے پروردگار نے تم سے ایک اچھا وعدہ نہیں کیا تھا؟ کیا (میری جدائی کی) مدت تمہیں دراز معلوم ہوئی یا تم نے چاہا کہ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف غضب نازل ہو؟ اور (اس لئے) تم نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا۔ وہ کہنے لگے کہ ہم نے اپنے اختیار سے تم سے وعدہ خلاف نہی کیا بلکہ ہم لوگوں کے زیوروں کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے پھر ہم نے اس کو آگ میں ڈال دیا اور اسی طرح سامری نے ڈال دیا۔ تو اس نے انکے لئے ایک بچھڑا بنا دیا (یعنی اس کا) قالب جس کی آواز گائے کی سی تھی تو لوگ کہنے لگے یہ تمہارا معبود ہے اور موسیٰ کا بھی معبود ہے مگر وہ بھول گئے ہیں۔ کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیتا اور نہ ان کے نقصان اور نفع کا کچھ اختیار رکھتا ہے۔ اور ہارون نے ان سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ لوگو! اس سے صرف تمہاری آزمائش کی گئی ہے اور تمہارا پروردگار تو خدا ہے تو تم میری پیروی کرو اور میرا کہا مانو۔ وہ کہنے لگے کہ جب تک موسیٰ ہمارے پاس نہ آئیں ہم اس (کی پوجا) پر قائم رہیں گے۔ (پھر موسیٰ نے ہارون سے کہا) کہ ہارون جب تم نے ان کو دیکھا تھا کہ گمراہ ہوگئے ہیں تو تم کو کس چیز نے روکا؟۔ (یعنی) اس بات سے کہ تم میرے پیچھے چلے آؤ بھلا تم نے میرے حکم کے خلاف (کیوں کیا؟)۔ کہنے لگے بھائی میری داڑھی اور سر (کے بالوں) کو نہ پکڑیئے میں تو اس سے ڈرا کہ آپ یہ نہ کہیں کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور میری بات کو ملحوظ نہ رکھا۔ (سورۃ طٰہٰ آیت 85 تا 94)

قریب قریب انہی الفاظ میں اس واقعہ کا سورۃ اعراف میں بھی ذکر ہے۔

قرآن کا صدق بیان:

قران مجید حضرت ہارون کو گوسالہ سازی کے الزام سے بری کرتے ہوئے سامری کو گوسالہ کا موجد بتلاتا ہے۔ حامیان بائیبل توریت کے بیانکی حمایت میں تمسخر و استہزاء کی صدائیں بلند کرتے ہیں اور قرآن کے بیان کو غلط ثابت کرنے کے لئے کہتے ہیں کہ سامری در حقیقت کسی شخص کا نام نہیں بلکہ شہر سامرہ کے رہنے والے کو اس شہر کی نسبت سے سامری کہتے ہیں شہر سامرہ بنی اسرائیل کے ایک بادشاہ نے جس کا نام "عمری" تھا جناب سلیمان کے تقریباً پچاس برس بعد بسایا تھا للذا گوسالہ کے واقعہ کے تخمیناً 570 برس بعد شہر سامرہ کی بنیاد پڑی۔ شہر کے آباد ہونے سے 570 برس پہلے حضرت موسیٰ کے زمانہ میں کہاں سے کوئی سامری گوسالہ بنانے کے لئے پیدا ہوگیا۔ ؟

عیسائیوں کا یہ اعتراض ظاہر فریب ضرور ہے لیکن لیکن معلوم نہیں کہ یہ تمسخر قرآن کے ساتھ ہے یا اپنی جہالت و ناواقفیت پر. یہی وہ مقامات ہیں جہاں قرآن کی عمیق النظری پر سجدہ کرنا پڑتا ہے اور قرآن کی تحقیق و تدقیق کے انمول جواہر کے سامنے آنکھیں چکاچوند ہونے لگتی ہیں۔ قرآن مجید نے جو شخص سامری گوسالہ کا موجد بتلایا ہے وہ شہر سامرہ کا رہنے والا کوئی شخص نہیں ہے بلکہ در حقیقت شمرون بسیا کر ابن یعقوب کی نسل میں سے ایک شخص ہے۔ چنانچہ کتاب پیدائش بات آیت 13 میں اس شمرون کا ذکر موجود ہے اور توریت کتاب عدد بات 26 آیت 23 میں یہ ذکر موجود ہے کہ شمر دلی لوگ یعنی شمرون بن بسیاکر کی اولاد حضرت موسیٰ کے ساتھ تھی جسکی تعداد ہزاروں تک پہنچتی تھی۔ جس سامری کا قرآن میں ذکر ہے وہ در حقیقت شمرونی ہے لفظ "سامری" لفظ "شمرونی" کا معرب ہے، چنانچہ شہر سامرہ جس کا سابقاذ کر ہوا ہے عربی تو اس کو سامرہ کہتے ہیں لیکن توریت کی اصل عبرانی زبان میں اسکو "شمرون" کہا جاتا ہے اسی طرح یونانی انگریزی، فرانسیسی، تراجم میں بلکہ عربی و فارسی تراجم کے علاوہ قریب قریب جملہ زبانوں کے تراجم میں اس شہر کا نام جو سلاطین اول و دوم اور کتاب اشعیا وار میاوعاموس و میخاوعزراو نحمیا میں ساٹھ مقام سے زیادہ استعمال ہوا ہے "شمرون" ہی لکھا ہے اسی طرح انجیل لوقا انجیل، یوحنا اور اعمال الرسل میں "سامری"، "سامریہ" سامریین" کے الفاظ تقریبا نو جگہ

استعمال ہوئے ہیں، اور عربی فارسی کے علاوہ تمام زبانوں کے تراجم میں لفظ "شمرونی" وغیرہ لکھا ہے۔ جسکے بعد لفظ "سامری" کا "شمرونی" کا معرب ہونا بلااشکال واضح اور گوسالہ کے واقعہ میں قرآن کی اچھوتی تحقیق نہایت درجہ مستحق تحسین اور توریت کا بیان قابل افسوس ثابت ہوتا ہے۔

ملحدین کے قرآن پر اعتراضات کے ماخذ- محققین کی آراء

قرآن کے مصنفین نامی سیریز کے مجہول مصنف نے اپنی کہانیوں کے لیے جن کتابوں سے مواد اٹھایا ان میں کلئیر ٹسڈل کی کتاب "قرآن کے اصل ماخذ" اور ابن ورق کی کتاب "The Origins of the Koran: Classic Essays on Islam's Holy Book" " سر فہرست ہے۔ان مصنفین اور انکی کتابوں کے متعلق جدید محققین کی رائے پیش ہے۔

ابراھم گیگر کی کتاب: Was hat Mohammed aus dem Judenthume aufgenommen

عیسائی مشنریوں کی زمانہ قدیم سے یہ کوشش رہی ہے کہ وہ کسی طرح یہ ثابت کر دیں کہ قرآن ایک بے مقصد (نعوذ باللہ) کتاب ہے جس کو بائبل سے نقل کیا گیا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم محض ایک فراڈ تھے (نعوذ باللہ)۔اس طرزِ عمل کا آغاز صلیبی جنگوں کے ساتھ ہو، تحریری صورت میں البتہ اس مشن کو انیسویں صدی میں ایک یہودی ابراہم گیگر نے آگے بڑھایا۔اس شخص نے ایک کتاب لکھی ? Was hat Mohammed aus dem Judenthume aufgenommen : جس کے اندر قرآن میں یہودی مواخذ سے تعلق رکھنے والی چیزوں کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔یہ کتاب 'مماثلت کا مطلب سرقہ' کے مفروضے پر مشتمل ہے۔ گیگر کے مطابق کسی مشترک چیز کے موجود ہونے کا مطلب نقل ہے اور محمد صلی اللہ وعلیہ وسلم نے قرآن میں موجود چیزیں عبرانی بائبل اور یہودیوں کے دوسرے مواخذ سے حاصل کیں۔

اس کتاب میں یہ بتانے کی زحمت نہیں کی گئی کہ کیا محمد صلی اللہ وعلیہ وسلم کے زمانے میں عبرانی بائبل کا کوئی عربی ترجمہ موجود تھا اور وہ کونسا یہودی ربی تھا جس نے محمد صلی اللہ وعلیہ وسلم کو یہ چیزیں پڑھائیں ؟مزید قرآن کے مواخذ کے بارے میں بھی کوئی حوالہ موجود نہیں ہے۔

یہ بات باعث حیرت نہیں کہ عیسائی مشنریوں اور پادریوں نے مسلمانوں سے نپٹنے کے لیے اس کتاب کا فوراًانگریزی ترجمہ بھی کرالیا۔

"مصنف نے اس مضمون کے لکھنے کے ایک سال بعد ہی اسے اپنے خرچ پر جرمن زبان میں شائع کروایا اور سرورق پر یہ چیز بھی لکھوائی گئی تھی کہ اس کتاب کو یونیورسٹی پرائز بھی دیا جا چکا ہے۔1896 میں ایف ایم ینگ نے (جن کی تقرری بنگلور انڈیا میں تھی اور جو دہلی مشن برائے خواتین کے معاون تھے) نے اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا اس امید پر کہ انڈیا میں موجود عیسائی مشنریز کو مسلمانوں سے نپٹے کے لیے اس سے مدد حاصل ہو گی۔دو سال بعد عیسائیت کی ترویج کرنے والی دہلی مشن سوسائٹی نے مدراس میں اس ترجمے کو چھپوایا۔"

(Abraham Geiger, Judaism And Islam (English Translation Of Was hat Mohammed aus dem Judenthume aufgenommen?), 1970, Ktav Publishing House Inc., New York, pp. VIII)

گیگر کی کتاب کے متعلق جدید محققین کی آراء:

جدید محققین نے گیگر کی کتاب میں مبالغہ آرائی اور غلط بیانی کو واضح کیا ہے۔گیگر کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے سٹلمن کہتے ہیں:

"اس کتاب میں قرآن کے لیے یہودی تعاون کو بہت بڑھاچڑھا کر بیان کیا گیا ہے۔بہت سی روایات جن کے حوالے اس نے پیش کیے ہیں عیسائیوں، تلمود اور ہیگادک ادب میں بھی ملتے ہیں۔آج کے زمانے میں مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کی بہت سی کتابیں شائع ہونے کے بعد ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اب ہمیں گیگر سے زیادہ واقعات کی ترتیب کا علم ہے۔اس کی روشنی میں اب ہمیں یہ پتہ چلا ہے کہ گیگر کو جہاں یہ لگا کہ قرآن میں یہودی ماخذ استعمال ہوئے ہیں، درحقیقت اس کا الٹ بھی ہو سکتا ہے۔جیسے کہ The Pirqe de Rabbi Eli'ezer جسکو اسلام کے ظہور میں آنے کے بعد ایڈیٹ کرکے شائع کیا گیا تھا۔

(Norman A. Stillman, "The Story Of Cain & Abel In The Qur'ân And The Muslim Commentators: Some Observations", Journal Of Semitic Studies, 1974, Volume 19, p. 231.)

حتمی جائزے میں سٹلمن لکھتے ہیں کہ: حتمی طور پر، اس بات پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ کسی کہانی کو کسی خاص ماخذ سے منسوب کرتے ہوئے انتہائی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔(Ibid., p. 239.)

ویلر (Brannon M Wheeler) بھی سٹلمن کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے ایک ایسی کثیر الجہتی تحقیق کی ضرورت ہے جس میں ان مواخذ کی تواریخ پر کام کیا جائے اور یہ پتہ لگایا جائے کہ ایسے تمام یہودی اور عیسائی مواخذ جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسلام کے ظہور میں آنے کے بعد شامل کیے گئے، کیا واقعی اسلام سے پہلے بھی موجود تھے اور انھوں نے اسلام پر اثر ڈالا یا کہ ان پر اسلام کی وجہ سے کوئی اثر پڑا۔" (Brannon M Wheeler, "The Jewish Origins Of Qur'ân 18:65-82? Reexamining Arent Jan Wensinck's Theory", Journal Of The American Oriental Society, 1998, Volume 118, p. 157)

ڈبلیو سینٹ کلیئر ٹسڈل کی کتاب "قرآن کے اصل ماخذ:"

کلئیر ٹسڈل نے گیگر کی کتاب میں پیش کیے گئے مفروضوں کو بڑھایا اور ان میں اضافہ کرتے ہوئے ایک کتاب پیش کی۔ عیسائیت کی ترویج کرنے والی سوسائٹی نے ڈبلیو سینٹ کلیئر ٹسڈل کی کتاب "قرآن کے اصل ماخذ" کو بھی 1905 میں چھپوایا۔ یہ نئی کتاب گیگر کی کتاب کا ہی ایک تسلسل تھا اور اس میں کچھ نئے مواخذ کا بھی اضافہ کیا گیا تھا۔

گیگر کی طرح ٹسڈل نے بھی محمد صلی اللہ وعلیہ وسلم کے زمانے میں عیسائیوں اور یہودیوں کے عربی میں موجود مواد کا کوئی ذکر نہیں کیا اور نہ ہی یہ بتایا ہے کہ محمد صلی اللہ وعلیہ وسلم کو یہ چیزیں کس نے پڑھائیں، سوائے اس دعویٰ کے کہ محمد صلی اللہ وعلیہ وسلم کو بتانے والے کچھ لوگ موجود تھے۔ عیسائی علوم کی ترویج کرنے والی اس سوسائٹی کا مقصد بالکل واضح تھا۔ ٹسڈل بھی اپنی کتاب کے متعلق لکھتا ہے:

"عیسائی مشنریز معروف مسلمانوں سے سوالات کا نیا طریقہ دریافت کرنے اور انہیں اپنی ناقابل دفاع پوزیشن سے باخبر کرنے کے لیے 'ہماری ان تحقیقات کی پیروی کو اہم پائیں گیں۔"

(Rev. W. St. Clair Tisdall, The Original Sources Of The Qur'ân, 1905, Society For The Promotion Of Christian Knowledge, London, pp. 28)

ٹسڈل کی کتاب "قرآن کے اصل ماخذ" دراصل عیسائی مشنریوں کی ایک نئی بائبل ہے جو مسلمانوں کو فروخت کی گئی۔ اس کتاب کا مقصد ایسے مسلمانوں کے ذہن میں شکوک شبہات پیدا کرنا ہے جو تحقیقانہ ذہن نہیں رکھتے اور نہ ہی ان کتابوں میں مستعمل طریقہ واردات سے واقف ہیں۔ ٹسڈل کی سستی اور شرمناک سکالرشپ اسکے مضامین "محمد صلی اللہ وعلیہ وسلم کے اپنے بیویوں سے بائبل کی تعلیم لینا، حضرت سلمان فارسیؓ، ہابیل اور قابیل کا واقعہ ,سامری کی کہانی کا ماخذ وغیرہ میں پیش کیے گئے دلائل سے بہت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

جدید سکالر ٹسڈل کے کام کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

جدید سکالر ٹسڈل کی کتاب "قرآن کے اصل ماخذ" یا ایک اور مشنری ولیم موئیر کی کتاب 'اسلام کے ماخذ' کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ فرانکوئیس ڈی بلوئی (FranÇois de Blois) ابن وراق کی کتاب "قرآن کے ماخذ: اسلام کی مقدس کتاب پر کلاسیکل مضامین" میں موجود ٹسڈل کے حوالوں کے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"اسکے کلاسیکل مضامین کوئی اہمیت نہیں رکھتے، ان سے بھی بدتر سینٹ کلیئر ٹسڈل کا پیش کردہ حقیر مشنری پراپیگنڈہ ہے۔۔ یہ بات حیران کن ہے کہ " مصنف جو اپنی کتاب "میں مسلمان کیوں نہیں "میں خود کو تنقیدی سوچ رکھنے والا اور قدامت پسندی کی تمام شکلوں کا سخت مخالف ثابت کرنے کے لیے اتنا بڑھ چڑھ کے لکھتے ہیں، نے اس کتاب میں انیسویں صدی کے دو عیسائی مناظر کی لکھی ہوئی باتوں پر اس درجہ انحصار کیا ہے۔"

(FranÇois de Blois, "Review of Ibn Warraq's The Origins Of The Koran: Classic Essays On Islam's Holy Book", Journal Of The Royal Asiatic Society, 2000, Volume 10, Part 11, p. 88)

اس طرح کا ایک جائزہ ہربرٹ برگ (Herbert Berg) نے بھی پیش کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ:

"سینٹ کلیئر ٹسڈل کا مضمون جس کا پیش لفظ ولیم موئیر نے لکھا ہے فقط عیسائی نقطہ نظر کے لیے شامل کیا گیا ہے۔۔ یہ ہر گز عالمانہ مضمون نہیں ہے یہ صرف مخالفانہ خصوصیات کا حامل ہے۔اس میں عیسائیوں کی تاریخ کو صرف مسلمانوں کی نفی کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ مصنف نے ان قرآنی واقعات کو جو عیسائی تعلیمات اور اولڈ ٹیسٹامنٹ کے منافی ہیں'کاذکر کرتے ہوئے "بیوقوفانہ"، "خیالی"، "بچگانہ"، اور "جاہلانہ" جیسے الفاظ کا بے دریغ استعمال کیا ہے۔"

(Herbert Berg, "Review of Ibn Warraq's The Origins Of The Koran: Classic Essays On Islam's Holy Book", Bulletin Of The School Of Oriental & African Studies, 1999, Volume 62, p. 558.)

یہ الفاظ دیگر ٹسڈل کا مواد نہ صرف عیسائی مشنریوں کا حقیر پراپیگنڈہ ہے بلکہ قرآن اور یہودی تصنیفات پر ایک بے بنیاد اور بے رحمانہ حملہ ہے، خصوصاً جہاں مصنف کے خیالات انکی تعلیمات سے مختلف ہیں۔اس کتاب کا مواد کس حد تک جھوٹ اور غلط بیانی پر مشتمل ہے اسکی تفصیل گزشتہ تحاریر میں بھی پیش کی جاچکی ہے جن سے واضح ہے کہ مستشرقین کے نزدیک عیسائیت کی ترویج بعض دفعہ سچ اور حق گوئی سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

یہ عیسائی مشنریوں کی عادت ہے کہ انھوں نے جدید تحقیق اور محققین کی رائے کو کبھی اہمیت نہیں دی، بصورت دیگر کون ان کی اچھی خبروں پر یقین کرتا۔

ابن ورق اور اسکی کتاب "قرآن کے ماخذ: اسلام کی مقدس کتاب پر کلاسیکل مضامین:"

ابن ورق کی یہ کتاب کلئیر ٹسڈل کی کتاب سے ہی ماخوذ ہے۔ابن ورق کی کتاب "قرآن کے مآآخذ" کا جائزہ لیتے ہوئے مذہبی تعلیمات کے پروفیسر ہربرٹ برگ نے ابن وراق کو ایک ایسا مصنف گردانا ہے جس کا انداز اپنی تحاریر میں انتہائی مناظراتی اور متضاد ہے۔برگ نے اس مجموعے میں تھیوڈور نولڈیکے کے مضمون کو شامل کرنے کے اقدام کو سراہا ہے لیکن ولیم سینٹ کلیئر ٹسڈل کے مضمون کی شمولیت پر کڑی تنقید کرتے ہوئے کہا کہ یہ مضمون ہر گز عالمانہ نہیں ہے۔برگ لکھتے ہیں

"ایسا لگتا ہے کہ ابنِ وراق نے بعض مضمون جو اپنے مجموعے میں شامل کیے ہیں ان کی شمولیت کی وجہ علمی یا تاریخی ہونے کی بجائے صرف یہ تھی کہ وہ مضمون اسلام کے خلاف لکھے گئے تھے۔اس بات سے ہر گز یہ مت سمجھا جائے کہ ابنِ وراق کے مجموعے کی اہمیت کم ہو گئی ہے، بلکہ یہ بات ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ مجموعہ قرآن کے متعلق تاریخی اسکالرشپ کی نمائندگی نہیں کرتا"۔

(Berg, Herbert (1999). "Ibn Warraq (ed): The Origins of the Koran: Classic Essays on Islam's Holy Book". Bulletin of the School of Oriental and African Studies 62 (3): 557–558.)

پروفیسر فریڈ ڈونر نے ابن ورق کے مضمون "تاریخی محمد صلی اللہ و علیہ وسلم کی تلاش" کا جائزہ لیتے ہوئے اسکی عربی میں ضروری مہارت کی کمی کو نوٹ کیا اور لکھا کہ ابنِ وراق نے اپنے مضمون میں عربی مواد کو متضاد طریقے سے استعمال کیا ہے، دلائل غیر اصلی ہیں، ترمیمی نظریات کے حامل لوگوں کی طرف حد درجے کا جھکاؤ اور رجحان ہے اور کتاب کا پہلے سے موجود ایک مخصوص ایجنڈہ ہے جو کہ ہر گز عالمانہ نہیں بلکہ محض اسلام پر اٹیک ہے۔ " (Donner, Fred. (2001) Review: The Quest for the Historical Muhammad. Middle East Studies Association Bulletin, University of Chicago)

انتھروپالوجسٹ اور تاریخ دان ڈینیئل مارٹن ویریسکو نے ابنِ وراق کی کتاب Defending the West: A Critique of Edward Said's Orientalism : پر تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ اس ایک کتب فروش کے ماڈرن بیٹے نے ایک مناظراتی مغالطہ تحریر کرکے پانچ سو سے زائد صفحات کو ضائع کیا ہے۔

(Daniel Martin Varisco (2009). "Orientalism's Wake: The Ongoing Politics of a Polemic". MEI Viewpoints (12))

ابنِ وراق کی کتاب "قرآن کے مآخذ" بذات خود ٹسڈل کی کتاب سے ماخوذ ہے جو کہ فرانکس ڈی بلوئے کے مطابق " ٹسڈل کی کتاب اصل میں سستے عیسائی مشنری پراپیگنڈے کے سوا کچھ نہیں۔"

(Blois, FranÇois de (2000). "Review of Ibn Warraq's The Origins Of The Koran: Classic Essays On Islam's Holy Book". Journal of the Royal Asiatic Society)

اسماء افسر الدین لکھتی ہیں کہ:

"ابنِ وراق نے ایک تعمیری بحث میں دلچسپی نہیں لی، بلکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی بات کو بغیر کسی دلیل اور مباحثے کے پورے کا پورا تسلیم کر لیا جائے، اسماء نے یہ اضافہ کیا کہ "قرآن کے ماخذ" نہ صرف ایک زہر آلود ماحول کو پروان چڑھاتی ہے بلکہ ایک دیانت داری سے کی جانے والی علمی بحث کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں کی بھی بیخ کنی کرتی ہے۔ (Asfaruddin, Asma; Warraq, Ibn (2001). "The Quest for the Historical Muhammad". Journal of the American Oriental Society (American Oriental Society))

مستشرقین کا چیلنج اور علماء کی ذمہ داری

عالم اسلام پر مستشرقین کے جو منفی اثرات مرتب ہورہے ہیں اس کے لیے لازم ہے کہ ایسے صالح الفکر مسلمان محققین و مصنفین تیار ہوں جو اسلامی موضوعات پر جدید طرز تحقیق اور ماخذ و مراجع کی صحت و استناد کے حوالے سے ریسرچ کریں اور ایسے علمی و تحقیقی اسلوب، استدلال و استنتاج اور طرز نگارش کو بروئے کار لائیں جو مستشرقین پر ہر لحاظ سے فوقیت لے جائیں 'ساتھ ہی ان کی علمی کوتاہیوں، دسیسہ کاریوں اور افتراپردازیوں کا پردہ چاک کرکے واضح اور درست خطوط فراہم کریں۔ایسا نہ کیاگیا تو جدید تعلیم یافتہ طبقہ مستشرقین کے مسموم افکار و خیالات اور ان کی فکری غلامی سے اپنے آپ کوزیادہ دیر تک آزاد نہیں رکھ سکے گا۔

میکاوٗلی کے اس اصول "کہ مقصد عظیم ہو تو اس کے حصول کے لیے ہر ذریعہ استعمال کرنا جائز ہے" کو مستشرقین نے خوب استعمال کیا، تحقیق کے لبادے میں اسلامی تعلیمات کو مسخ کرکے کے لیے انھوں نے ہر قسم کا حربہ استعمال کیا۔حالانکہ میکاوٗلی نے یہ اصول سیاستدانوں کے لیے وضع کیا تھا۔مغرب کی سیاسی و معاشی بالا دستی عالم اسلام کو ہر محاذ پر کمزور کرنے کی اپنی سازش میں پوری طرح کامیاب ہے وہ اپنے مشنری مقاصد کے فروغ کے لیے حیات انسانی کے ہر گوشے پر قابض ہیں اور اس کے لیے جس خاموش حکمت عملی کا مظاہرہ کررہے ہیں ہم پوری طرح اس سے نابلد ہیں۔وہ اسلام کے تئیں اپنے رویے میں لاکھ نرمی اور اخلاص کا اظہار کریں۔شوق علم و تحقیق، ایثار و وفا اور انصاف پسندی کا خوب ڈھنڈورا پیٹیں لیکن قرآن کا یہ اعلان ہمہ وقت ہمارے پیش نظر رہے کہ "تم سے یہود و نصاریٰ ہر گز راضی نہیں ہوں گے جب تک کہ آپ ان کے مذہب کے تابع نہ بن جائیں" (البقرۃ:۱۲۰)

مستشرقین کا سب سے اہم ہتھیار جس سے انھوں نے مسلمانوں کو متاثر کرنا چاہا اس کا تعلق سیرۃ سے ہے،ان کی تحقیقات کا مقصد سیرت طیبہ کی اصلی روح مجروح کرنا، واضح صداقتوں کا انکار کرنا اور سیرت نگاری کرتے ہوئے غلط فہمیوں کو جگہ دینا اور لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بارے میں غلط تاثر پھیلانا۔سیرت کے کسی موضوع پر لکھنے سے پہلے اس کے متعلق ایک موقف قائم کر لیتے ہیں پھر اس کے لیے وہ کمزور سے کمزور روایات ڈھونڈتے اور ان سے غلط استدلال اور معنی اخذ کرتے ہیں۔مثلا بشار بن بود، ابونواس جیسے مشاہیر فُسانی اور زناوقہ کی تحریریں "کتاب الاغانی"، "کتاب اخوان الصفا"، ابو نعیم کی "کتاب الفتن" اور اس قسم کی دوسری کتابوں سے مواد لیتے ہیں۔بعض بالکلیہ جعلی کتابیں جو کسی قدیم مصنف کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں۔مثلا عبداللہ بن ابن داود کی طرف منسوب کتاب "المصحف"، زبیر بن بکار کی طرف منسوب "کتاب نسب قریش"، بو علی سینا کی طرف منسوب "رسالہ حشر الاجسار" وغیرہ ان کے مقاصد کے لیے بڑی کار آمد ثابت ہوتی ہیں۔ان کے ہرکارنامے کے پیچھے کچھ زہریلے جراثیم چھپے ہوتے ہیں، جواسلامی تاریخ کو کھاتے چلے جاتے ہیں اور دین کے روشن حقائق کو بھیانک بنادیتے ہیں، اس سے انکار نہیں کہ ان کی تحقیقات سے بعض اوقات مسلمانوں کو فائدہ بھی پہنچا اور مسلمانوں نے فائدہ اٹھایا بھی؛ کیونکہ ان کے دفعات میں سے ایک اہم دفعہ یہ بھی ہے۔علامہ سید سلیمان ندوی نے ایک موقع پر اس تشوش کا اظہار کیا تھا:

"ان کی یہ قابل قدر سرگرمیاں ہمارے شکریہ کی مستحق ہیں؛ لیکن ظاہر ہے کہ یہ علوم ان کے نہ تھے، اس لیے وہ ہمدردی اور محبت جومسلمانوں کو اپنی چیزوں سے ہوسکتی ہے ان کو نہیں ہے اس لیے ان کی تحقیق وتدقیق سے جہاں فائدہ ہورہا ہے، سخت نقصان بھی پہنچ رہا ہے، جس کی تلافی آج مسلمان اہل علم کا فرض ہے، ان میں ایک ایسا گروہ ہے جو اپنے مسیحی نقطہ نظر سے اسلامی علوم پر نظرڈال کر تحقیق وریسرچ کے نام سے ایک نیامحاذِ جنگ بناکر، اسلام، داعی اسلام، اسلامی علوم اور اسلامی تہذیب وتمدن پر بے بنیادحملہ کررہا ہے، قرآن مجید، حدیث، تصوف، سیر، رجال، کلام اور فقہ سب ان کی زد میں ہے، نہیں کہا جاسکتا کہ یورپ کے اس رنگ کے لٹریچر سے اسلام کو کس قدر شدید نقصان پہنچا ہے اور پہنچے گا؛ اگریہ زہر اسی طرح پھیلتا رہا اور اس کا تریاق نہیں تیار کیا گیا تو معلوم نہیں کس حد تک نوجوان مسلمانوں کے دماغوں میں سمیت سرایت کرجائے گی"۔

(اسلام اور مستشرقین:۱/۱۱۔۱۲، مرتب عبدالرحمان اصلاحی)

نو مسلم یورپی مفکر محمد اسد کی آراء میں مستشرقین (قدیم و جدید کی کاوشوں اور ان کے خیالات و تصورات نے عام مغربی ذہنوں کو مسموم کر دیا ہے؛ چناچہ ان کی (ان کے علاوہ دیگر مسلم مفکرین کی بھی) تحریریں مغرب میں اسلام کی دعوت و تبلیغ اور اس کی تفہیم کی راہ میں بڑی رکاوٹ بن گئی ہیں، ان مستشرقین کی نگارشات کے زیر اثر عام یورپی و امریکی افراد اسلام کی کسی طور پر درخور اعتناء نہیں گردانتے، وہ اسلام اور اس کی روحانی اخلاقی تعلیمات کو کسی بھی نقطہ نگاہ سے کچھ زیادہ وقیع اور قابلِ احترام نہیں سمجھتے، نہ وہ اسے عیسائیت اور یہودیت سے موازنہ کے قابل خیال کرتے ہیں،.

اس وقت علمائے ہند کے کاندھوں پر کتنی ذمہ داری ہے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔علامہ سید سلیمان ندوی نے ایک جگہ لکھا اسلام وہ مذہب ہے کہ جس دن وہ دین بنا اسی دن وہ سیاست بھی تھا۔اس کا منبر،اس کا تخت، اس کی مسجد، اس کی عدالت،اس کی توحید نمرودوں اور فرعونوں، قیصروں اور کسراؤں کی شہنشاہی کے مٹانے کا پیغام تھی۔صحابہ اور خلفاء کی پوری زندگیاں ان مرقعوں سے بھری پڑی ہیں اور وہی اسلام کی سچی تصویریں ہیں اور جب تک علماء علماء رہے وہی ان کا اسوہ تھا۔آج ضرورت ہے کہ اسی نقش قدم پر چلیں جو ہمارے اسلاف نے ہمارے لئے چھوڑا ہے۔آج علماء کا کام صرف پڑھانا، مسئلے بتانا اور فتوے دینا سمجھا جاتا ہے، لیکن اب وقت ہے کہ اپنے اسلاف کے وقت کو پھر دہرائیں اور دیکھیں کہ ان کا کام صرف علم و نظر تک محدود نہیں بلکہ سعی و عمل اور عملی خدمت بھی ان کے منصب کا اہم فرض ہے۔

مستشرقین کے چیلنج کے مدنظر علامہ سید سلیمان ندوی کے اس ارشاد گرامی پر عمل کرنے کی ضرورت ہے کہ ہر آبادی جہاں علماء رہیں وہ ان کی سعی اور خدمت سے آباد رہے۔ وہاں جاہلوں کو پڑھانا، نادانوں کو سمجھانا، غریبوں کی مدد کرنا مسلمانوں کو ان کی کمزوریوں سے آگاہ کرنا ایک عالم دین کا فرض ہے۔(ماخوذ از المستشرقون والاسلام واصلاحی خطبات)

اسلامی مطالعہ کے اصول و ضوابط

ایک زمانہ تھا کہ جب اسلام کا گہرائی میں مطالعہ بڑی حد تک دینی مدارس اور علماء تک محدود تھا اور عوام انہی کی تحقیقات سے استفادہ کرتے تھے۔ پھر مستشرقین نے بالعموم اپنے مذموم مقاصد کے تحت اس کی طرف توجہ کی اور ہر موضوع پر تحقیقات ، کتابوں کے انبار لگا دیے، اسکی تفصیل ایک وسیع دائرہ میں پیج پر زیر بحث آ چکی ہے۔انکی یہ تحقیقات ایک طرف علماء کے لیے چیلنج ہیں ' کہ وہ انکے پیدا کی گئ گمراہیوں، اشکالات کا جواب لکھیں اور انکے جھوٹ، فریب کا پردہ چاک کریں ، عوام کے لیے بھی ان حالات میں بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ دین کے مطالعے اور بحث و تحقیق میں بے پرواہی کے مظاہرے سے بچیں۔

یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ، دانشور اور مفکرین دینی علم میں دلچسپی لے رہے ہیں، یونیورسٹیوں اور درس گاہوں میں اس کی درس و تدریس ہو رہی ہے۔ مختلف اسلامی موضوعات پر غوروفکر اور بحث اور مباحثہ جاری ہے اور یہ دیکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ آج کے دور میں اسلام کی کیا معنویت اور افادیت ہے اور زندگی کے پیچیدہ مسائل میں وہ ہماری کیا راہنمائی کرتا ہے؟

یہ بات بھی بڑی قابل قدر ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو ہر چیز کو مغرب کی عینک سے دیکھنے کا عادی رہا ہے اور جس نے کبھی اسلام کی طرف توجہ بھی کی تو مستشرقین کے زیر اثر کی، اب اس کے نقصانات کو محسوس کرنے لگا ہے اور آزاد علمی فضا میں اسلام کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام کے مطالعہ کے سلسلہ میں ان جدید مفکرین کی طرف سے بعض بنیادی باتوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، یا یہ کہ ان کی اہمیت نہیں محسوس کی جاتی ہے۔اس وجہ سے یہ مطالعہ ناقص اور ادھورا ہی نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات اس سے اسلام کی بارے میں شدید غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور اعتراضات اور جوابات کا ایک طویل سلسلہ چل پڑتا ہے، یہاں ہم اسلام کے تفصیلی اور تحقیقی مطالعہ کے لیے بعض اصول و شرائط کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جنکی پابندی سے ناصرف مستشرقین اور اہل باطل کے اسلام پر اٹھائے گئے اشکالات کی حقیقت کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے بلکہ ذاتی مطالعہ و تحقیق میں بھی غلط نتائج سے بچا جاسکتا ہے.

1. جو موضوع زیر بحث ہو، انڈکس یا سرچ انجن کی مدد سے، اس سے متعلق حسب منشا اک دو جملوں کو لے لینا , یا ان سے مکمل آئیڈیا لے لینا صحیح نہیں ہے بلکہ اس سلسلہ کے تمام نصوص کا غیر جانب داری اور اخلاص کے ساتھ مطالعہ ہونا چاہیے۔ بجائے اس کے کہ ان نصوص کو کسی مزعومہ فکر و خیال کی تائید یا تردید میں استعمال کیا جائے، ان کے الفاظ، اسلوب، سیاق و سباق اور پس منظر کی روشنی میں ان کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی جائے...!

2. جس مسئلہ میں قرآن مجید کے علاوہ حدیث یا تاریخ سے روایات بھی زیر بحث ہوں ان روایات کی صحت کا اطمینان ضرور کر لیا جائے۔ ہو سکتا ہے کسی حدیث سے آپ کچھ نتائج اخذ کرتے چلے جائیں اور ائمہ حدیث اسے حدیث ہی نا مان رہے ہوں یا وہ اس قابل ہی نا ہوکہ اس سے وہ نتیجہ اخذ کیا جاسکے جو آپ نے کیا, یوں آپ کے اخذ کردہ نتائج کی پوری عمارت از خود منہدم ہو جائے گی۔

3. جو حکم زیر بحث ہو اس کے متعلق یہ جاننا ضروری ہے کہ آیا وہ وقتی اور عارضی ہے یا ابدی اور دوامی، عام ہے یا خاص، اس کے ساتھ کوئی شرط لگی ہوئی ہے یا وہ غیر مشروط ہے، وہ وجوب کے لیے ہے یا محض ندب و استحباب کے لیے؟!!! جب تک اس کی صحیح نوعیت متعین نہ ہو جائے اس کے بارے میں گفتگو آگے نہیں بڑھائی جا سکتی۔

4. کسی بھی حکم کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے صرف ان نصوص کا مطالعہ کافی نہیں ہے جن میں براہ راست وہ حکم آیا ہے۔ شریعت کے کسی حکم کو الگ سے دیکھنے میں بعض اوقات غلط فہمی کا امکان ہوتا ہے لیکن اسی کو اگر دین کی پوری تعلیمات کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ غلط فہمی دور ہو سکتی ہے۔ مثلا اسلام میں چور کا ہاتھ کاٹ دینے کا حکم ہے۔ایک شخص اسے جرم کے مقابلہ میں انتہائی سخت اور غیر معمولی سزا قرار دے سکتا ہے لیکن جب وہ یہ دیکھے گا کہ اس حکم کو نافذ کرنے سے پہلے اسلام انسان کے اندر خدا اور آخرت کا خوف پیدا کرتا ہے، معاشرہ میں ہمدردی و غم خواری کے جذبات کو نشوونما دیتا ہے۔ ریاست کو غریبوں اور ناداروں کی معاشی کفالت کی ہدایت کرتا ہے اور اس بات کی نگرانی کرتا ہے کہ کوئی شخص ایسے حالات میں نہ

گھر جائے کہ وہ چوری کے ذریعہ اپنا پیٹ بھرنے پا مجبور ہو جائے، تو اس کی رائے بدل سکتی ہے اور اسے وہ حق بجانب قرار دے سکتا ہے کہ یہ حکم ہر حال یا موجودہ حالات میں نافذ کرنے کو نہیں کہا جارہا..بلکہ اس سے پہلے عوام کو وہ ماحول دیا جارہا ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے اس جرم کے ارتکاب کی کوئی وجہ نہیں رہتی.

5. یہی رویہ اور اصول کسی تاریخی شخصیت کے متعلق کوئی نظریہ قائم کرنے سے پہلے مدنظر رکھنا ضروری ہے.یہ اک غیر معقول بات اور ناانصافی ہوگی کہ کسی شخص کی عام عادات, صفات اعمال, مزاج, اقوال, مقام کو بالکل نظرانداز کرتے ہوئے اک دو مجروع روایات کی بنیاد پر اسکے متعلق کوئی نظریہ قائم کر دیا جائے..

6. اسلام کے بنیادی ماخذ- قرآن و حدیث- عربی زبان میں ہیں۔اسلام کے اپنے طور پر کیے گئے تفصیلی مطالعہ کے لیے اس زبان سے، اس کے الفاظ کے دروبست سے اور اس کے اسلوب و انداز بیان سے اچھی طرح واقف ہونا ضروری ہے۔قرآن اور حدیث کی زبان کلاسیکی, معیاری اور ادبی ہے . ان کے لفظ لفظ مین معانی کی ایک دنیا آباد ہے. عربی زبان کی اعلیٰ صلاحیت کے بغیر آدمی اپنے طور پر محض کسی اک ریسورس یا ڈکشنری سے ان باریکیوں کو مکمل نہیں سمجھ سکتا جو ان میں چھپی ہوئی ہیں.. لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اسلامی مسائل پر بحث و تمحیض کے لیے عربی زبان کا گہرا علم کیا معنی سرسری واقفیت بھی ضروری نہیں سمجھی جاتی.. جس سے بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور آدمی تحقیق کے دوران بعض اوقات غلط رخ کی طرف نکل جاتا ہے .

7. رسول اکرم صلی اللہ علیہ و علی آلہ وسلم نے اسلام کو محض ایک نظریہ کی حیثیت سے نہیں پیش کیا بلکہ اس کی بنیاد پر ایک امت برپا کی، ایک معاشرہ قائم کیا اور ایک مملکت کا نظام چلا کر دکھایا، پھر آپ کے بعد خلفاء راشدین نے اسی نہج پر اسے جاری رکھا۔ یہ اسلام کی ایک مستند عملی تفسیر ہے۔اسلام کا مطالعہ اس عملی تفسیر کو نظر انداز کرکے نہیں ہو سکتا۔ کسی بھی مسئلہ پر سوچتے وقت یہ دیکھنا بالکل فطری بھی ہے اور ضروری بھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و علی آلہ وسلم اور خلفاء راشدین کے دور میں اسے کس طرح سمجھا گیا اور اس پر کس طرح عمل درآمد ہوا۔اسلام کی ہر وہ تعبیر و تشریح جسے یہ دور مبارک رد کر دے کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتی۔

اسلام کے مطالعہ کے سلسلہ میں ان بنیادی باتوں کو پیش نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔ورنہ اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ ہمارا مطالعہ غلط رخ پر ہونے لگے اور ہم اپنے خود ساختہ تصورات کو اسلام کی طرف منسوب کر بیٹھیں۔اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی قرآن و حدیث کو اپنے مزعومہ افکار و خیالات کے لیے استعمال کیا گیا اور انھیں ٹھیک ٹھیک سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی تو بڑی بھیانک غلطیاں سرزد ہوئیں، مختلف فرقے وجود میں آئے اور امت کا شیرازہ منتشر ہو کر رہ گیا۔اسلام کی تعبیر و تشریح میں اس سے پوری طرح احتراز کرنا چاہیے۔

استفادہ تحریر: اسلام کے مطالعے کے اصول وشرائط, سید جلال الدین عمری, سہ ماہی تحقیقات اسلامی, علی گڑھ